حضرت مولانا محمد سعد صاحب
کے اقوال اور
ان پر ہوئے شبہات کا ازالہ

دوسرا ایڈیشن مع اضافات

از

عبدالحفیظ بن معروف ناظم عبداللہ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

حضرت مولانا محمد سعد صاحب

کے اقوال اور

ان پر ہوئے شبہات کا ازالہ

دوسرا ایڈیشن مع اضافات

ناشر: مکتبہ احمدیہ

جامعہ حسینیہ راندیر

سورت، گجرات، انڈیا۔

99746 04855

ناشر: مکتبہ حبان

ایلول نزد نور مسجد

تحصیل: ہمت نگر، ضلع: سابر کانٹھا

گجرات، انڈیا

94090 22314

از : عبدالحفیظ بن معروف ناظم عبداللہ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

تفصیلات

جملہ حقوق بحق ناشر و مؤلف محفوظ ہیں۔

نام کتاب: حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال اور ان پر ہوئے شبہات کا ازالہ

جامع و مرتب: جناب حضرت مولانا قاری عبد الحفیظ صاحب ایلولوی۔ دامت برکاتہم
خادم الحدیث والعقائد، جامعہ حسینیہ، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

صفحات : ۲۲۴

دوسرا ایڈیشن: مع جدید اضافات ۱۴۴۱ھ بمطابق ۲۰۲۰ء

تحریک تبلیغ کے موجودہ حالات میں۔
مثبت انداز میں علوم اسلامیہ کی
روشنی میں بحکمت وبصیرت۔
غلط فہمی کا ازالہ

انتباہ

جب کوئی کام تقاضۂ وقت کے نتیجہ میں بہ طور ہنگامی سرانجام پاتا ہے تو کمی نہ سہی لیکن مضبوطی کی کچھ وجوہ باقی ضرور رہ جاتی ہیں، اس کتاب کے ساتھ یہی معاملہ ''پہلے ایڈیشن'' میں پیش آیا۔ اس لیے اب دوسرے ایڈیشن میں کچھ ضروری اضافات شامل کیے جاتے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے پڑھ لینے والوں کی رعایت میں اضافہ کی جگہ یہ نشان (⬅) دیا ہے اور ختم پر یہ (➡) تاکہ انہیں دوبارہ پوری کتاب پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔

نوٹ: کتاب کے بارے میں الحمدللہ ثم الحمدللہ ہندو بیرون ہند کے اہل علم حضرات کے نہ صرف مثبت تاثرات سامنے آئے بلکہ بڑی بڑی مسندوں کے حامل علماء حضرات۔ دامت برکاتہم۔ جو صحاح ستہ کے قدیم اساتذہ اور مالک اہتمام ہیں نے اسے لائق تحسین اور قابل قدر اقدام قرار دیا اور ساتھ ہی کہا کہ بہت ہی اعتدال اور نگاہ حق کے ساتھ کام کیا ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے۔ لیکن عالم اسباب میں یہ بھی ایک حقیقت ہوتی ہے کہ جب کوئی کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو اسے اپنے علوم پر پورہ اعتماد بھی ہوتا ہے اور دو تین حضرات کے سوالات بھی ہوئے ان ہی کے جوابات کے لیے آخر کتاب میں اضافات شامل کیے۔

فہرست عنوانات

نمبرشمار	مضامین	صفحہ نمبر
ا	ابتدائیہ	۸
۲	عقیدہ، خوف خدا اور عقل کے کردار	۱۱
!!	بندہ کی سادہ بلکہ پاکیزہ سمجھ	۱۶
●●	داعیۂ تالیف	۱۶
؟؟	معترض کا منشا و خیال	۱۷
؟	اعتراض کا پوسٹ مارٹم	۱۹
!!!	تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک	۲۰
!!	دعوت و تبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر	۲۲
!	تاویل و توجیہ کی ایک جھلک	۲۵
؟؟	تاویلات کا راستہ یا اعتراض کا انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے	۲۸
←	دین و شریعت کا ایک مختصر خاکہ	۳۰
؟؟	لوگوں کا ردِ عمل	۳۶
✡	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراض کا حال	۳۷
ا	وجوہ اعتراضات	۴۰
ب	تعیین معنی میں خطا کی وجوہات	۴۳
ج	تعیین معنی میں سب سے مقدم اور بہتر طریقہ	۴۵
۳	’’رجال دین‘‘ کے قابل اعتراض چند اقوال	۴۷

د	طلب فتویٰ اور دارالعلوم کا فتویٰ	۵۶
ھ	طلب فتویٰ غلط اقدام تھا	۵۷
و	ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی	۵۸
ز	وجہ قول معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ	۶۰
ح	افسوس دارالافتاء سے نہ ہو سکا!	۶۱
ط	عدم سبقت ذہن اور تاویلات سے غفلت	۶۴
ی	عدم سبقت ذہن ہی راجح ہے	۶۶
←	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے سکوت کی وجہ	۶۷
●●	منزل انتظار یعنی توجیہات کی جانب	۶۹
●	مقام عبرت	۷۰
●	اہل علم حضرات کی توجہ	۷۲
⇆	علوم اسلامیہ کی وسعت و گہرائی کے شواہد	۷۲
۴	علوم ظاہرہ وعلوم باطنہ کی باریک نزاکتیں	۷۴
۱	افتراق بلا تضاد کی پہلی مثال	۷۸
۲	افتراق بلا تضاد کی دوسری مثال	۷۸
۳	افتراق بلا تضاد کی تیسری مثال	۷۹
۴	افتراق بلا تضاد کی چوتھی مثال	۸۳
۵	افتراق بلا تضاد کی پانچویں مثال	۸۴
۵	رجال دین کے اقوال کی توجیہات	۸۵

✡	حضرت مولانا محمد سعد پر ہوئے اعتراضات کے جوابات	۹۶
٦	جوابات سے پہلے انتہائی اہم امور واصول	۹۷
!!!	مذہب اسلام کی جامعیت وکمالیت	۱۱۹
ا	اصول جرح وتعدیل فی الروایہ	۱۲۰
ب	امام میں جرح وتعدیل کی شرائط	۱۲۱
ج	جرح میں تساھل کے اسباب	۱۲۲
د	نہایت توجہ کے قابل مقام	۱۲۴
ھ	منبع حق ''قرآن'' کا فیصلہ، فیصلۂ حق کے لیے	۱۲۴
۷	امیر وشوری کی شرعی حیثیت	۱۲۷
ا	شرعاً امیر کا ہونا واجب ہے، یہ اجماعی مسئلہ ہے	۱۲۷
ب	پھر مسلمانوں کے امیر کا صرف ایک ہونا بھی ضروری ہے	۱۲۹
ج	زبردستی امیر بننے والے کی بھی اطاعت ضروری ہے	۱۳۰
د	حضرت عمرؓ کی بنائی شوری کی حقیقت	۱۳۴
۸	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات	۱۴۱
*	توجیہات سے پہلے کچھ ضروری نظائر	۱۴۲
(۱)	اعتراض : موبائل سے متعلق اقوال کی توجیہ	۱۴۶
(۲)	اعتراض : حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں تنقیص	۱۴۸
(۳)	اعتراض : ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی	۱۵۱
(۴)	اعتراض : اسباب دنیویہ کی نفی	۱۶۰
●●	جدید تعبیر اعترض کی چیز نہیں ہے	۱۶۵

(۵)	اعتراض :اجرت علی التعلیم اجرت علی الزنا کے مثل ہے	۱۶۶
●●	تعلیم وتبلیغ میں فرق	۱۶۹
(۶)	اعتراض : معجزہ کا سبب دعوت ہے	۱۷۱
(۷)	اعتراض :خروج فی سبیل اللہ فرائض شرعیہ پر مقدم ہے	۱۷۳
(۸)	اعتراض : قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے	۱۷۵
(۹)	اعتراض : فرشتوں کا اورنگ آباد کے اجتماع میں نزول	۱۷۶
(۱۰)	اعتراض :جو مجھے امیر نہ مانے وہ جہنم میں جاوے	۱۷۸
(۱۱)	اعتراض : بغیر حضور قلب کے ذکر کرنے والا گنہگار ہے	۱۷۹
(۱۲)	اعتراض :حیاۃ الصحابہؓ کے علاوہ کتابوں کو پڑھنے سے روکنا	۱۸۱
(۱۳)	اعتراض :تکمیل توبہ کے لیے اللہ کے راستہ میں نکلنا شرط ہے	۱۸۲
(۱۴)	اعتراض :تنہائی میں گناہ کرنا اصل بے حیائی ہے	۱۸۳
(۱۵)	اعتراض :تمام مسائل کو مرکز لے کر آیا کرو	۱۸۴
(۱۶)	اعتراض :دعوت وتبلیغ کی چھ صفات مکمل دین ہے	۱۸۴
(۱۷)	اعتراض : مشورہ میں حاضری کا اہتمام نماز سے زیادہ ہو	۱۸۵
!!!	آخر میں سب سے اہم بات	۱۸۶
(۱۸)	حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے دینی طرز عمل کی حقیقت	۱۸۷
⇆	عام غلط فہمی کا ازالہ	۱۹۰
۹	مسلّم دستور اور دعوت وتبلیغ کے دو زمانے	۱۹۶
⇆	خاتمۃ الکتاب	۲۲۰

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ دعوت وتبلیغ کا المیہ اس لیے بھی عظیم وحیرت ناک ہے! کہ اس میں پہلی بار کوئی بے نمازی شخص چلہ لگانے پر پانچ نمازوں کے ساتھ تہجد اور مسواک کا اہتمام کرنے لگ جاتا ہے اور خواتین مسجدوں کی جماعتوں کے اوقات اور وہاں کے مشوروں کو جان رکھتی ہیں اور بچے گھر کی تعلیم کی وجہ سے صحابی بننے کی بات کہتے ہیں! ماشاء اللہ ۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی بھی قدم خطرہ سے خالی نہیں، وہ ایک پل صراط پر قائم ہونے کی طرح ہے، لیکن اگر کوئی خوش قسمت! اپنے پاؤں میں ''حقیقی دین'' کی پیروی کی زنجیر ڈال کر ۔ روایتی دین کی نہیں ۔ اور عقل وبصیرت سے پوری طرح لیس ہو کر کوئی قدم اٹھائے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ۔

پھر بھی اسے خدا کو '' عَلِيۡمٌ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ '' میزان عدل کو '' فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ '' اور اپنی تیاری کو '' فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۔۔۔'' مستحضر رکھنا ہوگا جس میں ذرّہ ہے جبال نہیں ۔ یہ خیال نہ ہو یہ کاوش خود '' لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ '' کا مصداق ہے ۔ بالکل صحیح اگر تالیف کا داعیہ پیش نہ آتا، پھر بھی ہم نے تالیف میں بساط بھر ایسی زنجیر ڈالی ہے جس کی کڑیوں کا مشاہدہ ہر وہ شخص کرے گا جو اپنے نفس کا مالک ہو یعنی سادہ ذہنیت اور عقل وشعور کا مالک ہو اور کتاب کو از اول تا آخر اور وہ بھی پوری طرح سمجھ کر پڑھے ۔ کیوں کہ ہم نے نہ تو کسی پر بے محل، نہ تو حد اعتدال سے ہٹ کر کوئی ایسی انگلی اٹھائی ہے کہ وہ پلٹ کر ہم پر اٹھے ۔

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ موقع پر ''حق وصدق'' کا اظہار نہ کیا جائے، پھر تو کام ہی کیا ہوا، دراصل انگلیاں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں، سوائے بقدر استحقاق '' اخی فی الدین ''

معترض پر وہ بھی بربادی سے بچانے کے صالح ارادہ سے ۔ وَاللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ۔ اس لیے ہم نے اس نزاعی مسئلہ میں باعث کلفت وندامت نہ بناتے ہوئے برسبیل حکمت بڑی شخصیات کی توثیقات کا بھی اہتمام نہیں کیا۔ بس ان وجوہ سے ہمیں یقین ہے کہ۔ ان شاء اللہ۔ یہ کتاب بلا کسی تفریق تمام احباب امت میں مقبول ومفید ہوگی۔ داعیہ کا پیش کیا آنا تھا، وہ ایک خدائی اشارہ تھا بس صالح ارادہ سے کام شروع کر دیا بلکہ '' وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ '' کی طرح شروع ہو گیا، پھر تو منّ وسلویٰ اور بادل کے سایہ کی طرح نہ صرف اس نے ایک انگلی پکڑی ، پورا ہاتھ ہی اس قدر تھاما کہ حرکت تو قلم کی پر محرک وہ، روشنائی تو قلم کی پر پرتو اس کا!!

مدتوں پہلے کے مضامین دل ودماغ میں مچلنے لگے، ان کا اس قدر فیضان گویا کوئی معلم ہے اور راقم اس کا متعلم ۔ اسی وجہ سے تعلیمی مصروفیات ''بالامانت'' کے باوجود کام اواخر ربیع الآخر سے شروع ہو کر اواخر جمادی الثانیہ میں صرف دو ماہ میں اختتام کو پہنچا۔ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَظِيْمِ '' کتاب کا خاص مقصد معترض صاحب کو حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے خلاف گمراہی کی تشہیر واشاعت سے ''علی حد الشرع'' روکنا ہے ۔ ملاحظہ ہو داعیۂ تالیف صفحہ ۱۶۔ اگر یہ پیش نہ آتا تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی ان توجیہات کی بھی نوبت نہ آتی جو مدتوں اور سالوں سے دل ودماغ میں تھیں جن کا اظہار رفقاء سے کرتے تھے۔ معترض صاحب کا احسان کہ وہ داعیہ بنیں ان توجیہات کے اظہار کا اور اس کا بھی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ حقیقی احوال اب سامنے آویں۔

ہم نے ان توجیہات کو قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ دیگر علوم اسلامیہ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش اس لیے کی ہے تا کہ علماء حضرات علمی ممارست کی وجہ سے حضرت کے اقوال کو اچھی طرح سمجھ سکیں، بایں وجہ کچھ لوازماتی مباحث بھی شامل ہو گیے، جنہیں فہرست سے سمجھا

جاسکتا ہے۔ اور دوسرا مقصد چوں کہ ہمارے نزدیک اس بارے میں کوئی بھی قصداً بڑا قصور وار نہیں ہے گویا ایک طرح کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے اور لوگ اس معاملہ میں بڑے غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں جو ''زخم پر نمک چھڑکنے'' سے باز نہیں آرہے ہیں تو پھر لوگوں کو سنجیدہ بننے اور اس بربادی سے بچنے کی راہ بتانے میں زور زیادہ صرف ہوا جو کسی بڑی شخصیات یا کسی عام مسلمان پر تہمت وغیرہ کا لازمہ ہے۔

راقم کا یہ مزاج ہے اور اکثر عوام وعلماء حضرات کے بارے میں اس کا کمزور خیال بھی یہ ہے کہ وہ نہ تو براہ راست قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ سے اپنی اصلاح کا خیال اپنے دلوں میں رکھتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے کما حقہ اصلاح وتہذیب سے وہ محروم رہتے ہیں۔ خصوصاً علماء حضرات کو تو اس کا اہتمام تعلّم کے زمانہ سے ہونا چاہیے تاکہ ان کی زندگیوں میں چار چاند لگ جائیں!

نوٹ : قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی خطا پائیں تو آگاہ فرماویں بصد تکریم قبول ہوگی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے خاتمۃ الکتاب صفحہ ۲۲۰ ضرور پڑھ لیں۔ بعض مقامات پر حوالہ ''بیاض'' ہوگا ضروری نہیں کہ سالوں کے مطالعات کے مصادر بروقت مستحضر ہوں۔ عمدہ تعبیرات کے استعمال میں اگر تحقیر کا رنگ پاویں تو اسے کلام کا حسن وزینت سمجھیں نہ کہ تنافر۔ کتاب میں اصولی بحثیں ہیں اسے بے حد سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہوگی۔

عبد الحفیظ ایلولوی عفی عنہ۔

خادم التدریس جامعہ حسینیہ، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

۲۸ جمادی الثانیہ ۱۴۴۰ھ

عقیدہ، خوف خدا اور عقل کے کردار

اِنَّ رَبَّ العِزَّۃِ جَلَّتْ قُدرتُہٗ یَستَغْنِیْ عنِ الْعَالَمِیْنَ لَا یَنْتَفِعُ بِکَثْرَۃِ شُکرِھِمْ وَلَا یَضُرُّہٗ زِیَادَۃُ کُفْرِھِمْ۔ ترجمہ :حقیقت ہے کہ ربّ العزّت ''طاقت وغلبہ کا مالک'' جس کی عظیم قدرتیں ہیں دنیاوالوں سے ایسا مستغنی ہے کہ نہ تو وہ ان کے کثیر شکروں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ توان کے کفر کی زیادتی اسے ضرر پہنچاتی ہے۔ذیل کے مضمون کوغور سے پڑھیے۔

آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہی نہیں جب تک وہ سچائی اور حقیقت کے ساتھ اپنے دل میں یہ عقیدہ نہ بٹھائے ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ '' پھر اس عقیدہ میں مزید حقیقت اور پختگی بھرنے کے لیے اسی دن سے خوف خدا لازم کردیا جاتا ہے۔اور اسے اپنے خدا کی قدرت کو ''اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ '' اس کی خبر اس کے علم کو '' اِنَّہٗ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ '' ''اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذاتِ الصُّدُوْرِ '''' یَعْلَمُ مَاتُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ '' سمجھایا جاتا ہے اور اپنی آخرت کے سامان کی یوں فکر دلائی جاتی ہے'' فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَرَہٗ، وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہٗ '' یہ خوف خدا جتنا اسلام لانے کے دن ضروری ہوتا ہے اتنا ہی ولایت میں قدم رکھنے کے دن اور زندگی سے آخرت کی طرف سفر کرنے کے دن بھی ضروری ہوتا ہے۔

اسلام نے ہر قسم کے انسداد جرائم کے لیے اور تمام قسم کے کمالات کے حصول کے لیے اسی کو بنیاد بتایا ہے ورنہ اس نے نہ تو پولیس محکموں اور عدالتی محکموں پر مکمل اعتماد کیا ہے اور نہ ظاہری تدین وعبادت گزاری پر مکمل اعتماد کیا ہے، بلکہ اسی خوف خدا پر اعتماد کیا ہے، کیوں کہ اگر یہ ہے تو آدمی ہر قسم کے گناہ سے بچ سکتا ہے چاہے گناہ کرنے کے سارے سامان ہوں اور اگر یہ

نہیں ہے تو وہ عبادات واخلاق کے سنہری پردوں میں بھی گناہ سے نہیں رک سکتا۔(⬅)

خوف خدا شریعت وطریقت کی وہ جان ہے جس کے مفقود ہونے پر باوجود یکہ اصول شریعت اختیار کیے جائیں "واقع" فوت ہوجاتا ہے اور معاملہ اور فیصلہ خلاف واقعہ ہوجاتا ہے مثلاً تنفیذ حدود اور ثبوت حلال وغیرہ کی جھوٹی شہادتوں میں۔ اسی لیے تو شہادت میں قسم کھلائی جاتی ہے "وَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ "(➡) خلاصہ یہ کہ اندر کا انسان اور اندر کی اصلاح ہی اصل اصلاح ہے پہلے دن بھی اور آخری دن بھی۔

مذکورہ باطنی پختہ نظام کے ساتھ انسان کو ایک اور جوہر سے نوازا جسے اپنے اس نیک عزائم میں معاون بنا سکے وہ ہے عقل کا جوہر۔ یہ خدائی بڑی نعمت ہے، اسی جوہر سے آدمی ترقی کے ممتاز مدارج طے کرتا ہے اور اس کے غلط استعمال سے ایسے قعر مذلت میں جا گرتا ہے جس کا تصور خود اسے اس کے غلط استعمال سے پہلے نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسے قرآن حکیم نے " نُهٰى " کہا ہے یعنی ہر قسم کی ذلت اور ہر قسم کے ضرر سے بچانے والی۔ بلکہ عرب کے فصیح وبلیغ شعراء نے اسے "صواب" اور " حق" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اسلام نے بھی ایک درجہ میں اس کو "حجت" کا مقام دیا ہے۔ انسانی افراد ہوں کہ ان کا مجموعہ اور جماعتیں ان سب کے ناپنے کا صحیح معیار یہی ہے، اسی سے جماعتیں اور معاشرے بگڑتے بھی ہیں اور سنورتے بھی اسی سے ہیں۔

اس جگہ عقل کا تذکرہ اس اہم مناسبت سے ہے کہ بسا اوقات "بظاہر بڑے" آدمی سے بوجہ غلبۂ خوف خدا شر اور فساد کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا لیکن جب وہ اپنے بلند مقام پر اس کے تقاضہ کے مطابق اپنے کاموں میں عقل سلیم کا استعمال نہ کرے تو پھر خوف خدا کے باوجود اس سے شر وفساد کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی طرف توجہ دلائی ہے " اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ " (سورۃ بقرہ ۱۲)

لیکن یہ پورا نظام یعنی اسلام کا اولیں عقیدہ، خوف خدا اور انسانی عقل ونظر سب ہی ایسا باطنی ''نظام'' ہے کہ صاحب معاملہ اور خدا کے سوا ''فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ'' کوئی نہیں جانتا، اس کا حقیقی علم صرف خدا کو ہے اس لیے کوئی کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ تزکیہ کر سکتا ہے نہ اس پر کسی برائی کا الزام دھر سکتا ہے ہاں اس کے اندازے کی کچھ علامات ہیں لیکن ان کا درجہ بس علامات کا ہے۔

(←) ہم نے پہلے ہی عنوان میں عقل کے کردار کا تذکرہ کیا ہے کیوں کہ وہ بہت ہی اہم ہے، اسی لیے تو ہم نے اس کا تذکرہ عقیدۂ اول اور خوف خدا کے ساتھ کیا ہے لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ لوگ اسے سمجھ نہیں سکے ہیں، لہٰذا ہم یہاں امام غزالیؒ کے حوالے سے عقل کی اہمیت کے کچھ شواہد احادیث مبارکہ کے کچھ ٹکڑوں سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرما کر فرمایا۔۔۔۔۔ اپنی عزت وجلال کی قسم میں نے کوئی مخلوق تجھ سے اشرف پیدا نہیں کی۔ تیری ہی وجہ سے ''لوگوں کو'' ثواب دوں گا اور تیری ہی وجہ سے ''ان کو'' عذاب دوں گا۔

(۲) قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے نزدیکی کے درجات لوگوں کی عقلوں کے مطابق مقرر کیے جائیں گے،

(۳) عقل جب کامل ہوتی ہے تو بندہ کا ایمان بھی کامل ہوتا ہے بایں طور کہ وہ اپنے رب کی اطاعت اور اپنے دشمن ''ابلیس'' کی نافرمانی کرتا ہے،

(۴) آدمی کی عبادت ''اعلیٰ ادنیٰ'' اس کی عقل کے بقدر ہوتی ہے۔

(۵) لوگوں نے جہاد اس قدر کیا (اور کرتے ہیں) جس قدر اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل عطا فرما رکھی ہے چناں چہ جیت بھی ان کی عقلوں اور ان کی نیتوں کے مطابق ہوئی (اور ہوتی ہے)۔۔۔ قیامت کے روز مراتب بھی وہ اپنی نیتوں اور عقلوں کے بقدر ہی پائیں گے۔

(۶) حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا دنیا میں لوگوں کی فضیلت کس چیز سے ہے؟ آپ نے فرمایا عقل سے، میں نے پوچھا اور آخرت میں کس چیز سے؟ فرمایا وہاں بھی عقل سے، میں نے پوچھا پھر انہیں ان کے عمل کا کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا اے عائشہ! انہوں نے عمل بھی تو اتنا ہی کیا ہوگا جتنی انہیں عقل ملی ہوگی، چناں چہ عقل کے بقدر اعمال ہوں گے اور اعمال کے بقدر جزا۔

عقل وہ نور بصیرت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ شریعت چاہے لائق استحسان ہے لیکن اس کے حق ہونے کا علم تو عقل ہی سے حاصل ہوتا ہے، اگر وہ ہی نہ رہے تو ایمان وتصدیق اور قبول شریعت کہاں رہے گا۔ (احیاء علوم الدین ۸۸ تا ۹۰ ج اول مطبع مصطفیٰ البانی مصر)

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحبؒ لکھتے ہیں ''ہم کسی کو اپنا مخالف نہ سمجھیں اور نہ اس کام کا مخالف سمجھیں، صرف عوارض ایسے پیش آتے ہیں کہ شیطان ایسے دلائل قائم کرتا اور ایسی علامت ظاہر کرتا ہے جس سے بڑے بڑے ولی بھی مخالفت پر تیار ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی نیک نیت کی وجہ سے ان کی ولایت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ انسان ظاہر کا مکلف ہے اور ایسے واقعات صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی پائے گیے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنین کہہ کر ہی پکارا ہے۔

ایسے وقت میں خداداد علم والا ہی اور سمجھ بوجھ والا ہی مسئلہ کو سنبھال سکتا ہے۔ کم سمجھ لوگ خواہ کتنا ہی علم رکھتے ہوں ایسے واقعات میں پھسل جاتے ہیں۔ صحیح تفقہ اور سمجھ کے بغیر علم بھی صحیح راستہ دکھانے سے عاجز ہوجاتا ہے اور اس کی مثالیں حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بہت پائی گئیں۔ اس زمانہ میں اپنی زبانوں کا جذبات قلبی سے دور رکھنا مشکل ہوگیا ہے جس کی وجہ سے حق بات بھی فتنہ پیدا کردیتی ہے کیوں کہ قلبی جذبات حق بات پر اثر ڈال کر حق کی

کیفیات سے محروم کرتے ہیں اور لوگوں کو اس بات سے مناسبت نہیں رہتی کہ سنا جائے اور قبول کیا جائے۔ (مکاتیب حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب حصہ دوم ۱۴۳)

اور ایک جگہ ''علم وسمجھ کی اہمیت میں'' لکھا ہے کہ ''اس لیے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کے ترجمہ میں ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اے اللہ میری سمجھ کو بڑھا۔ آج علم بغیر سمجھ کے چل رہا ہے جو بجائے اصلاح کے فساد پیدا کر رہا ہے۔'' (مکاتیب ۱۱۱ حصہ اول)۔ دیکھیے حضرت کی بات بھی ہماری بات کی مؤید ہے کہ آدمی چاہے ایمان باللہ اور خوف خدا کی وجہ سے ولایت پر فائز ہو لیکن سمجھ کی کمی کی وجہ سے اس سے وہ کام ہوسکتا ہے جو نہ ہونا چاہیے اور بالآخر اس سے فتنہ پیدا ہو۔ جس طرح نبی سے نبی کی شان کے موافق غیر مطلوبہ امور کا صدور ہوتا ہے۔ ''لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّر'' پھر امتی سے کیوں نہیں۔ یاد رکھیے جس طرح کبھی آنکھیں دھوکہ کھا جاتی ہیں، اس طرح علم بھی غلط عکاسی کر جاتا ہے جس کی وجہ عقل وسمجھ ہوتی ہے کہ وہ غلط عکاسی پر آمادہ کرتی ہے بس اسی لیے ہم نے عقل کو یہاں بیان کیا ہے۔ (←)

یہی ایک اہم وجہ ہے جس کی وجہ سے ہند و بیرون ہند بڑے بڑے علماء کرام ''دعوت وتبلیغ'' میں زیادہ مداخلت کرنے سے گریز کر رہے ہیں، ورنہ ان کے پاس علم کی کمی نہیں، بس وہ احتیاطی تدبیر کے ترجیح کے قائل ہیں، اس لیے کہ یہ بڑی پر خطر گھاٹی ہے۔ راقم بھی حتی الامکان اسی کے حق میں تھا۔ لیکن ایک داعیہ ایسا پیش آیا جس کے بعد اس میدان میں قدم رکھنا مذہبی فریضہ سمجھا اور یہ مختصر رسالہ مرتب کیا۔ اس داعیہ کی تفصیل سے پہلے کچھ پیش آمدہ مسئلہ پر روشنی پڑ جائے۔

بندہ کی سادہ بلکہ پاکیزہ سمجھ

بندہ کی سمجھ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ''بظاہر'' کوئی بھی شخص قصداً ابڑا قصوروار نہیں ۔ نہ حضرات ارباب شوریٰ، نہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم اور نہ تو حضرات علماء دیوبند۔ پھر بھی یہ مسئلہ بڑی حدتک نزاعی بن چکا ہے، ہمارا خیال ہے یہ ایک طرح کی ''اجتہادی ''خطا ہے (واللہ اعلم) اور ہر کوئی جانتا ہے ایسے مسئلہ میں اس مفسدہ، فتنہ اور خرابی سے نکلنے کی صحیح راہ یہی ہے کہ ہر ایک کا بے قصور ہونا واضح کیا جائے، لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں کہ مجھ جیسا شخص اسے انجام دے ''صَاحِبُ الْبَيْتِ أَدْرىٰ بِمَا فِيهِ '' خصوصًا مذکورہ بالا باطنی نظام میرے لیے مانع ہے کہ میں اس پر کچھ تحریر کروں جس کے پاس اس کی علامات تک کا علم نہ ہو۔

داعیۂ تالیف

داعیہ کی تفصیل سے پہلے راقم اپنا حال بتادینا چاہتا ہے بوجہ تقاضۂ حدیث شریف ''فَانْظُرُوا عَن مَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ '' اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے صرف تعلیمی مصروفیات ہی میں نہیں رکھا، تالیف کا کام بھی لیا جس تالیف پر بڑے حضرات نے لفظ ''تصنیف'' استعمال فرمایا۔ مزاج میں سادگی ہے عامۃً جو طلب جاہ ومال کا رنگ وڈھنگ دیکھا جاتا ہے اس سے اللہ نے بہت ہی دور رکھا ہے دین وعلم کے معاملہ میں حقیقت پسندی کا جوہر نمایا وصف ہے، عبادت گزاری یقیناً بقدر کفاف ہے لیکن دین وایمان اور علم وبصیرت کو اپنا متاع عزیز تصور کرتا ہے۔ زندگی میں کسی کو قصداً تکلیف وایذاء نہیں پہنچائی اور حب مسلم اور اس کے اکرام کا جذبہ زیادہ ہے یا خلوص للّٰہیت کا یہ فیصلہ از خود نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔ فللہ الحمد اولاً وَّاٰخِرًا '' فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ الموفّقُ وَالهَادِي '' تو آیئے ہم اس رسالے کے تالیف کا داعیہ کیا ہے وہ بتاتے ہیں۔

نوٹ : ہم پوری کوشش کریں گے کہ بات مثبت انداز میں کہیں اور بنظر انصاف کہیں لہٰذا آپ حضرات بھی بنظر انصاف پڑھیں اور دین وشریعت کو اور عقل وتیقظ کو شاہد رکھیں ۔ لہٰذا مسئلہ کو اعتدال پر لانے کے لیے جب ہماری کوئی بات کسی کی موافقت میں یا کسی کی مخالفت میں معلوم ہوتو اس وقت آپ کو بہکنا نہیں ہے، وہ نہ بیجا کسی کی موافقت ہوگی نہ مخالفت وہ اعتدال پر لانے کی ایک راہ ہوگی ۔ خصوصًا حضرت مولانا محمد سعد کی موافقت مشکل گھاٹی ہوگی کیوں کہ مسئلہ وہیں سے اٹھا ہے اور یہ معلوم ہوئی چکا ہے کہ ہم ان کے اقوال کی توجیہات پیش کرنے والے ہیں پھر بعض مقامات پر ان کی موافقت ہو یہ یقینی ہے ۔

راقم کی عادت نیٹ اور واٹ ساپ چلانے کی نہیں ہے اور نہ اس کی خاص جانکاری ہے جس سے کافی حد تک الحمد للہ مذکورہ خرابیوں سے اپنے آپ کو بچا رکھا تھا ۔ لیکن ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ کے بالکل آخری دنوں میں مطابق ۲۸ دسمبر ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ۷۰ اعتراضات کو عربی زبان میں تحریر کرکے کئی اوراق ” جناب حنیف شاہ زاہد شاہ صاحب کے“ جو پونہ شہر مہاراشٹر کے سپوت ہیں بندہ تک ارسال کردہ پہنچے ۔ موصوف عالم فاضل بھی نہیں بس انہوں نے اپنا تعارف ” اسلامی اسکالر“ بتایا ہے ۔

معترض کا خیال ومنشأ

یاد رہے کہ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم نے ہندوستان کے ہر بڑے دینی ادارے کو یہ اعتراضات بھیجیں ہیں اور تقاضہ کیا ہے کہ ہر ادارہ دار العلوم دیو بند کی تائید وتوثیق میں اپنا توثیق نامہ پیش کرے تا کہ خصوصًا عرب اسلامی ممالک اور دیگر بیرون ممالک کو آگاہ کیا جائے کہ ” مولانا محمد

سعد'' گمراہ[1] ہیں جس کی شہادت پر داخل ملک کے یہ سارے دینی ادارے متفق ہیں۔ جب بندہ نے ان کو پڑھا تو اپنے ذاتی طور پر رسالہ کو مرتب کر کے مسئلہ سے لوگوں کو واقف کرنا مناسب سمجھا۔

کیوں کہ جناب موصوف صاحب'' اخی فی الدین'' نے علی حدہ کاغذ ''برائے اردو دار الافتاء'' میں لکھا ہے کہ'' کرنول اجتماع صرف حکومت کے دس کروڑ روپیوں سے انجام پایا اور مولانا محمد سعد صاحب نے تبلیغی جماعت کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا'' اور یہ بھی کہ'' مولانا محمد سعد'' کے پیچھے ان پڑھ عوام کی ایک بھیڑ ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور عربی اوراق میں تو تہمت بازی دکھائی ہے مثلاً'' مولانا محمد سعد'' نے دعوتی طریقہ کو اپنی اور اپنی اولاد کی میراث قرار دیا۔ دیگر مشائخ تبلیغ کو ڈرایا دھمکایا، شریر لوگوں کو ان کے مخالفین کی پٹائی کا حکم دیا، وہ ہر معاملہ میں آزاد ہو گیے ہیں، اپنی طرف سے چند نئے احکام اور مشکوک نہج وضع کیا، قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی، نئی تعبیرات اور شاذ تفاسیر اختیار کیں جس کی وجہ سے انہیں دار العلوم دیو بند نے اقوال فاسدہ وعقائد باطلہ سے روکا اور ان پر گمراہ ہونے کا خوف ظاہر کیا تو ہم نے دار العلوم کا سہارا لے کر شیخ سعد کے خلاف جوابات طلب کیے۔ غور کی بات یہ ہے کہ اس پر کسی بھی عالم دین کا نہ نام ہے اور نہ دستخط، معلوم ہوتا ہے یہ کاوش خود اہل السنہ والجماعہ کے مخالف ہے۔ بلکہ دار العلوم کا نام لے کر اسے بدنام کرنا ہے۔

---

[1] اگر چہ معترض'' اخی فی الدین'' صاحب نے صریح گمراہ کا لفظ استعمال تو نہیں کیا تاہم ''اَلْکِنَایَۃُ اَبْلَغُ مِنَ الصَّرِیْحِ فِی التَّاْثِیْرِ'' کے بموجب ان کے یہ جملے ''اقوال فاسدہ، عقائد باطلہ، اور امت کو گمراہی سے بچانا، لوگوں کو ان سے اور ان کی باتوں سے دور رکھنا، پوری طرح اس پر دال ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی بعض جگہوں پر اسی کو سامنے رکھ کر اسے دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اعتراض کا پوسٹ مارٹم

اولاً توغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خیانت کی ہے۔ کیوں کہ دار العلوم نے اپنے اعلان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قابل اعتراض جو اقوال بیان کیے ہیں مثلا موسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ، توبہ کی شرط، وہاں ہدایت کا وہ قول نہیں بتایا جو ان اوراق میں اور وہ بھی سر فہرست بتایا ہے وہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہدایت نہیں ہے'' موصوف نے تو یہ بتایا جب کہ دار العلوم نے یہ لکھا ہے ''ہدایت ملنے کی جگہ مسجد کے علاوہ کوئی نہیں'' اور اسے تیسرے نمبر پر بتایا ہے اس کو دیکھ کر تو ان پر خیانت کا شبہ ہی نہیں خیانت کا الزام درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو حال تھا تحریری ثبوت کا۔ رہا مسئلہ مولانا کی زبان سے بذریعہ نیٹ سننے کا تو اس میں بھی خیانت ظاہر ہو رہی ہے وہ آپ حضرات ''مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات'' کے عنوان میں اعتراض نمبر تین میں ملاحظہ فرمائیں جس کی کلپ انہی سے منگائی تھی اور بندہ نے سنا تھا۔ دار العلوم کے بتائے ہوئے میں اور موصوف کے بتائے ہوئے میں کتنا شدید فرق ہے آپ سمجھ سکتے ہیں اگر وہ ہی تھا تو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے پھر تو دار العلوم کو اسے نمبر اول پر بیان کرنا چاہیے تھا۔

ہم یہاں ان کی دو باتوں کو لے کر سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلی بات انہوں نے لکھی ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ ان پڑھ لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ یعنی علماء ان کا ساتھ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اولاً تو اس کے جواب میں انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت مولانا نہ اپنی ذات کے لیے کسی کا ساتھ چاہتے ہیں نہ کسی کے ساتھ کا انکار کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اس کی صحیح طلب پر توفیق بخشے وہ ساتھ ہے اور پورے طور پر ساتھ ہے ورنہ اپنے معاملہ کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ رہا ان کا اس لیے ساتھ دینا کہ ان کا وہ نہج ''نہج امارت'' جس کو معترض نے مشکوک کہہ کر مجروح کیا ہے باوجودیکہ وہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ شریعت کے عین موافق ہے بلکہ ''نہج امارت'' ہی صحیح ہے، نہ کہ نہج شوریٰ۔

اسی طرح ان کے علم وعمل، زہد وتقویٰ اوران کے اقوال کی صداقت وحقانیت کی وجہ سے ان کا ساتھ دینااوراس کوثابت کر کے پیش کرنے میں ان کا ساتھ دیناوغیرہ تو وہ سمجھ لیں آج بھی ایسے علماء موجود ہیں جوان سب کوثابت کرنے کے ساتھ آپ کے مدعی کو باطل ثابت کر کے آپ جیسوں کی ناعقلی ولاعلمی پر ماتم کرنے کے دلائل اپنے دامن علم میں رکھتے ہیں اوراس کی وجوہ رکھتے ہیں کہ آپ کا یہ اقدام ''گمراہی نہ سہی'' خود ایک غیر شرعی ہے یا کم از کم فتنہ انگیزی اور ناعاقبت اندیشی توضرور ہے کیوں کہ اس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی گمراہی کی تشہیر گھر گھر جا کر کرنے کا حکم ہم سمجھتے ہیں نہ ارباب شوریٰ نے دیا ہوگا نہ دارالعلوم دیوبند نے تو پھر آپ یہ خواب دیکھنے سے دور رہیں کہ ہرکوئی آپ کا ساتھ اندھی تقلید کرتے ہوئے دے گا۔ دوسری بات کہ کرنول اجتماع میں۔۔۔اس کا جواب آپ ''دعوت وتبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر میں'' دیکھ لیں۔

تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک

دعوت وتبلیغ کا یہ کام اپنے حیرت انگیز کارناموں میں اوراحیاء دین وایمان کی تاثیر میں تمام تنظیموں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے بلکہ اس نے اس بارے میں بداہت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔جس کی تفصیل آگے دین وشریعت کے خاکہ میں آرہی ہے۔

یہاں ہم ایک عالم دین سے سنی ایک بڑی عبرت کی بات بتانا مناسب سمجھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ہم اسلام کے دیگر باطل فرقوں کے وجود کو قبیح وناپسند سمجھتے ہیں لیکن وہ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ حبّ نبی اور حبّ اولیاء کے زعم وعقیدہ میں اور قبر بوسی کے عمل میں اسلام کے نام لیوار ہے اسلام پر جمے رہے جس سے وہ کفر وشرک کی غلاظت سے محفوظ رہے۔ چاہے نہ ان کا عقیدہ درست تھا نہ ان کا عمل، لیکن اس غلط عقیدہ وعمل نے کفر وشرک کی گھاٹیوں سے بچا کرانہیں اسلام نما بنائے رکھا۔ (⬅) جیسا کہ شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی

صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے ''کفر بھی حکمت سے خالی نہیں'' (اصلاحی خطبات حصہ ۳۶/۶)۔ اور یہ صحیح ہے شرح عقائد میں ہے کہ ایمان کی طرح کفر بھی خدا کی مشیت سے ہے۔ (شرح عقائد ۴۳) (➡)

دوسری طرف خود اہل حق مسلمانوں کے ایمان ویقین سے حقیقت رخصت ہو چکی ہے وہ مردہ بن چکے ہیں، ان کے دین ویقین میں بھی حقیقت روح پیدا کرنے کی سخت ضرورتھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور دعوت وتبلیغ کا کام جاری فرمایا۔ جس سے ایک طرف اہل حق مسلمانوں کے دین وایمان میں جان پڑی بلکہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نامسلمان، مسلمان بنیں۔ تو دوسری طرف ان باطل عقیدہ مسلمانوں کو بھی بلا کسی تفریق ''ایمان ونماز کی'' دعوت دے کر نہ صرف ان کے باطل عقائد واعمال کی حکمت سے اصلاح کی بلکہ ان کے بازوئے دین وایمان کو مضبوط بھی کیا۔ آج لاکھوں مبلغین ایسے موجود ہیں جو ان باطل عقائد سے ہجرت کر کے حق کی طرف آئے اور آج خود بھی حق پر قائم ہیں اور دوسروں کو حق پر لانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس میدان میں کام کا قرعۂ فال نہ مدارس کے نام نکلا، نہ خانقاہوں کے نام، نکلا تو صرف دعوت وتبلیغ کے نام !! دعوت وتبلیغ کا یہ کارنامہ ''تاریخ'' میں ایک مثال بن کر یاد کیا جائے گا۔ یہ پہلو تو اس کے اپنے ماننے والوں کے بارے میں تھا۔ لیکن اپنے دائرے سے باہر آکر جھانکیں تو وہاں بھی اس کا حال عجیب سا ہے۔۔۔

یہ ایسی عظیم ترین تحریک ہے کہ پوری دنیا میں خصوصًا ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مذہبی زہر اگلا جا رہا ہے، ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کے جارحانہ حملے کیے جا رہے ہیں اور مذہبی کتاب، عبادت خانوں کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں ۵۰/۶۰ سال کے عرصہ میں قومی تصادم کے سینکڑوں واقعات پیش آئے اور آتے رہتے ہیں۔ اور ملکی غیر ملکی طاغوتی طاقتیں، مختلف قومیں، حکومتیں ان کا نام ونشان مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی

کا زور لگا رہی ہیں ان پر غلط جہاد کے الزام دھر کر انہیں کٹہرے میں کھڑا کر رہی ہیں ان کی ایک ایک نقل وحرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس عظیم تحریک پر ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی آنچ نہیں آئی، آج تک اس پر اندرونی اور بیرونی کوئی انگلی اٹھ نہیں سکی۔ آخر کیوں؟

یہ بیرونی حال تھا جب دونوں طرح کا حال یہ ہے تو پھر یہ کہنا بجا ہوگا کہ دعوت وتبلیغ تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک ہے۔ اس کی کوئی نظیر پوری اسلامی تاریخ میں نایاب ہے ہماری سمجھ کہتی ہے اب اگر کوئی مؤرخ تاریخ اسلام کو قلم بند کرے گا تو اس تحریک کو سرفہرست لکھے گا۔ یہ ایک کامیاب بے مثال، بے داغ تحریک ہے۔ اس کا روشن چراغ سخت تیز ہواؤں کے جھونکوں میں عالم کو منور کر رہا ہے، اس کی روشنی صحراء دریا اور چھوٹے بڑے جزیروں اور دیہات وشہر اور گلی در گلی جگمگا رہی ہے۔

دعوت وتبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا کہ آج تک محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دنیائے کفر وشرک اور فرق ضالہ یہود ونصاریٰ تو کیا، دنیائے اسلام کے دیگر فرقے بھی اس کے کسی عیب پر انگلی نہیں رکھ سکے اور اس کی مخالفت نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ اس تحریک کے اپنے سنہرے اصول ہیں مثلاً چھ نمبر، خود کے جان ومال کی شرط، خود پر نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، بے غرض بن کر کام کرنا، صرف رضاء الٰہی کی نیت رکھنا، دنیا کو حقیر سمجھ کر کرنا، آخرت کو دلوں میں اس طرح اتارنا کہ وہ نگاہوں کے سامنے ہوجائے، زبانوں پر ہمیشہ ایک ہی صدا ''اللہ ہی کرتے ہیں'' رکھنا، اپنے قیام کی جگہ مسجد کو بنانا، اپنے امیر کے نہ صرف حکم پر بلکہ اس کے اشاروں اور منشوں کو جان کر ان کو پورا کرنا، اور بطور خاص ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑا کر اجتماعی وانفرادی طور پر

تنہائی میں اور مجمع میں دعائیں کرتے رہنا یہ سمجھ کر کہ بس سارے کام صرف اللہ کے کرنے سے ہوتے ہیں۔اور سب سے بڑی بات نماز کے بارے میں یہ جملہ کہہ کر اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا''ہماری نمازوں سے ہمارے مسائل اللہ تعالیٰ حل فرمائیں وغیرہ کتنی بڑی بات ہے!!

اب بتائیے کہ جو کوئی جماعت اس طرح کام کرے اس سے کون ٹکرائے گا،ٹکرانے کا سوال تو دور کی بات لوگ پروانوں کی طرح کھینچ کھینچ کر چلے آتے ہیں اغیار بھی ان کی مدد کے لیے قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں جن کو یا تو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا تو ضرور ہوگا۔جس میں ایک کڑی شرط ہے خود کی جان خود کا مال،تبلیغ کا یہ ایسا نعرہ ہے۔اللہ اکبر۔ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اگر مالدار ہوتا ہے تو لوگوں پر اس طرح خرچ کرتا ہے جس طرح وہ اپنے بال بچوں پر اور اپنی ذات پر،اگر غریب ہوتا ہے تو بقدر کفاف اپنی ذات پر خرچ کے بعد مابقیہ کو اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے باوجودیکہ ساتھی خود مالدار اور خوش حال ہوتے ہیں۔ہم نے ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ ایک چلہ میں ایک ایک لاکھ روپے خرچ کرتا ہے۔وجہ خدا پر توکل ہوتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم معترض کے دوسرے جز کا جواب دیتے ہیں۔معترض نے کہا تھا کہ''کرنول اجتماع میں حکومت کے دس کروڑ روپے لگے''کیا آپ کو سفید جھوٹ صاف الزام تراشی نظر نہیں آرہی ہے۔ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کام کی بنیاد ہی خود کی جان ومال کے خرچ پر ہے اور تب ہی تو اس اس کے اچھے نتائج حاصل ہورہے ہیں،جو شخص بھی اس کام کی فطرت کو جانتا ہوگا اس قول کی تکذیب کرے گا،اس کام کی خمیر جاننے والا یقینا یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر بہت بڑا الزام ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں درست سمجھ عطا فرمائیں۔

سوچیے تو صحیح ہمارے یہاں عرف ہے معاملات میں جب کوئی کسی پر چند روپیوں کا الزام لگاتا ہے تو سامنے والا شخص فوراً ملزم سے ثبوت طلب کرتا ہے کہ کیا ثبوت اور کیا دلیل ہے کہ

تمہارے مجھ پر اتنے روپے ہیں؟ یہ حنیف شاہ صاحب اتنے ناسمجھ ہیں کہ اتنے بڑے الزام میں انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی، عرف کو بھی بھول گیے۔ کوئی سمجھ دار شخص اگر اتنا بڑا الزام غلط ہی سہی لگاتا تو وہ اس دعوی پر دلیل پیش کرتا چاہے غلط اور جھوٹی ہی سہی۔ جب اس ایک مسئلہ میں ان کا یہ حال ہے تو اور مسئلوں میں کیا حال ہوگا!! جیسے دعوت کے اصول میں بتایا کہ خود کی جان اور خود کا مال شرط ہے، عام مسلمانوں پر بھی اعتماد نہیں کرایا گیا۔ اسی وجہ سے تو اسباب کی شدت سے نفی کی جاتی ہے۔ کہ مسلمانوں سے چندہ لے کر کام کیا جائے، سوچنے کی بات ہے کہ جب اتنا احتیاط ہے بھلا وہ کام کب اس کی اجازت دے گا کہ غیروں کے مالوں کی طرف یا حکومت کی طرف نظریں اٹھائی جائیں۔ اور وہ بھی ایسی حکومت جس کا حال بچہ بچہ جانتا ہے۔ جناب حنیف شاہ صاحب میں ذرہ بھی عقل ہوتی تو یہ بات ہرگز نہ کہتے یہ تو ایسا ہے کہ بارش سے بھاگے تو پر نالے کے نیچے کھڑے ہوگیے، اٹھے تھے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراض اور الزام لگانے لیکن انہوں نے تو خود کام ہی پر الزام لگا ڈالا بلکہ تبلیغی حالات کے پردہ میں خود دارالعلوم دیوبند کو کمزور و بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔۔ یہی حال ہوتا ہے جھوٹ اور خیانت والوں کا "واللہ خیر حافظا"۔

ہائے افسوس! جو کام دنیائے کفر و شرک اور یہود و نصاریٰ نے نہیں کیا کہ وہ بھی اس کام کو اور کام کرنے والوں کو بری نظر سے نہیں دیکھتے وہ آج خود مسلمان نے کیا۔ شعر

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی	جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے	اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے

جب ہم نے دیکھا کہ یہ صاحب حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی گمراہی کی اشاعت میں مگن ہیں باوجودیکہ ہمارا دین اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ تو پھر ہم نے ارادہ کرلیا کہ ایک

رسالہ مرتب کیا جائے جس میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر عائد ہوئے اعتراضات کو ان کے اقوال کی توجیہات وتاویلات پیش کرنے کے ذریعہ دفع کیا جائے اور انہیں اس غلط اقدام سے روکنے کی کوشش شرعی طور پر کی جائے۔ یہی ہمارا اولیں مقصد ہے۔

دوسرا عظیم مقصد حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات پیش کرنا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ یہ حقیر بندہ دینی تینوں شعبوں ''مدرسہ، خانقاہ اور تبلیغ'' سے منسلک ہے اپنا پیر بھی رکھتا ہے لیکن دعوت وتبلیغ کو بہ چند وجوہ ترجیح دے کر اوقات بھی خرچ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے گاہے گاہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ بیانات بھی سنتا ہے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۹۷ء سے شروع تھا لیکن گنجائش وقت کے درجہ میں۔ جب سننے کے دوران کوئی بات تشوش کی آجاتی تو ابتداءاً وحشت تو ضرور ہوتی لیکن اس کے غلط ہونے کا تصور تو کبھی بھی کثرت کتب بینی سے حاصل اس علم سے جو خدا نے اس کے دامن میں سجایا اور دل میں آراستہ کیا ہے پیش نہیں آیا۔

بلکہ جب جب اس منزل میں قدم آگے بڑھتے گیے پھر تو '' كُلَّمَا ازْدَادَ زِدتُّ يَقِيْنًا وَّ ذَوْقًا '' بایں وجہ مذکورہ اقوال کی توجیہات پیش نظر تھیں لیکن کسی حد تک معاملہ میں قدم رکھنے کی شدید ضرورت نہ سمجھی، لیکن داعیۂ تالیف جب پیش آگیا تو تصور کیا کہ ''خدائی اشارہ آگیا'' تو پھر یہ رسالہ مرتب کیا۔ آپ اگر ان کی توجیہ کو بعید از امکان اور محال سمجھتے ہیں تو ہم صرف اس کی ایک جھلک دکھاتے ہیں کام تو اپنی منزل پر ہوگا اس پر غور کیجیے۔

تاویل وتوجیہ کی ایک جھلک

یہ ایک مثالاً توجیہ ہے جسے ہم بطور پیش خیمہ پیش کرتے ہیں۔ فقہ کے احکام سے ہر شخص واقف ہے کہ اس میں ساری اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً فرض، واجب، حرام، ناجائز وغیرہ۔ لیکن آپ ذیل کی اصطلاحات پر غور فرمائیں۔

علم کلام : فقہ کی طرح علام کلام میں بھی واجب اور جائز وغیرہ مستعمل ہیں۔ مثلا "رُؤيةُ اللهِ تَعالىٰ جَائِزَةٌ فِي الْعَقلِ وَوَاجِبةٌ بِالنَّقْلِ" (شرح عقائد ۵۶، ۵۸) اسی طرح "وَمَا هُوَ اَصلَحُ لِلْعِبادِ فَلَيسَ ذٰلكَ بِوَاجِبٍ علَى اللهِ تعالىٰ" (۷۵) اسی وجوب کے استعمال پر علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو تعجب ہے فرمایا " ثُمَّ لَيتَ شَعْرِيْ مَا مَعنَى وُجُوْبِ الشئِ على اللهِ تعالىٰ اِذ لَيْسَ مَعَنَاهُ استحقاقَ تارِكِهِ الذَّمَّ وَالعِقابَ " (۷۶) مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہونے میں فریقین متفق ہیں اس کے مطلب میں غیر متفق۔

نحو وصرف وادب : " وَفِي هٰذِهِ الاَفعالِ (افعال قلوب) لاَيَجُوزُ الِاقتصارُ عَلَى اَحَدِ الْمَفعُوْلَيْنِ (شرح مأة عامل ۵۶) صرف میں کہا جاتا ہے یہاں ابدال واجب ہے اور وہاں جائز۔ ادب میں " كَاَنَّهُمْ يَرَوْنَ مِنَ الواجِبِ ان يُبدِّلُوْا مَايُقال لَهُمْ " (قصص النبيين ۹۶/۳)۔ ان سب میں واجب، جائز اور ناجائز کا استعمال ہوا ہے۔ کیا ان مصنفین پر اعتراض کریں گے؟ یا ان مفسدوں سے نکلنے کے لیے کوئی تاویل کریں گے۔ یقینا تاویل وتوجیہ ہی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا بس اسی طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراضات سے بچنے کا راستہ ہے ایسا نہیں کہ ان کی توجیہ ہی نہ ہو۔

ایک اور مثال : ہم اپنے مدارس میں اسباب علم بتاتے ہیں مثلاً استاذ، کتابیں، کلاس وغیرہ کا ادب و لحاظ کرنا اور ذوق سے مطالعہ کرنا۔ صاحب عقائد نسفیہ اسباب علم بتاتے ہیں : "وَاَسْبَابُ الْعِلْمِ ثَلاثَةٌ اَلحَوَاسُّ السليمةُ وَالخبرُ الصادقُ وَالعقلُ" (شرح عقائد ۱۰) دیکھیے دونوں اسباب کے مفہوم میں کتنا فرق ہے!! لیکن اعتراض کی کوئی بات نہیں اس کی توجیہ ہے۔ وہ ان شاء اللہ سارے مضامین پڑھنے سے سمجھ آ جائے گی۔ یہ سب چیزیں غیر شرعی ہیں اور غیر شرعی چیز کو واجب یا جائز یا ناجائز کہنا شریعت میں مداخلت ہے اور حرام ہے بلکہ کفر کا بھی

باعث بن سکتا ہے۔اعتراض بنانا چاہیں تو اتنا بڑا بن سکتا ہے۔اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ یہ الگ الگ فن کی بات ہے اگر فقہ کے منصب پر رہتے ہوئے ان پر ان اصطلاحات کا اطلاق کیا جاتا تو مسئلہ بگڑتا لیکن منصب فقہ اور میدان فقہ سے ہٹ کر کہنے میں کوئی حرج نہیں۔اس جواب کو ذہن نشین رکھنا ہے۔

اسی طرح آپ ہمارے اعتراض کا جواب دیجئے اور وہ عین حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گیے یا ہوئے اعتراض ''ہدایت اگر اللہ کے ہاتھ میں ہوتی'' کے بالکل موافق ہے۔سوال ہے کہ گمراہی کس کے ہاتھ میں ہے؟

ایک : اگر آپ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو ''وَاَضَلَّهُم السامِرِیُّ''(پ۱۶) شاید قرآن کی اس آیت کا آپ انکار کر رہے ہیں اور قرآن شریف کی آیت کے انکار کا اگر فتویٰ بس اتنا ہی طلب کریں تو صاف جواب آئے گا کہ ''قرآن کی آیت کا منکر کافر ہے''۔

دوم : اگر آپ کہیں کہ گمراہی سامری کے ہاتھ میں ہے تو بھی بہ ظاہر فتویٰ یہی آئے گا کہ آپ کافر ہیں حالانکہ ''بظاہر'' آپ یہ بھی قرآن ہی کی بات کہہ رہے ہیں کیوں کہ قرآن ہی کی آیت شریفہ ہے کتنا سنگین حال ہے اور کتنا سنگین اعتراض ہے۔اب بتائیے کہ آپ اس کو لے کر ''دارالافتاء جائیں گے'' جس کا صاف جواب دونوں صورتوں میں وہی ہے جو ہم نے بلا کسی تفصیل کے بتا دیا۔یا آپ کسی عالم دین صاحب بصیرت شخص سے توجیہ و تاویل طلب کریں گے تا کہ آپ کا دین و ایمان سالم رہے!!۔معلوم ہوا کہ سنگین سے سنگین قول کی بھی تاویل ہوسکتی ہے جب اس کا عمل ''امکان'' کا ہو۔بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال امکان کی حد سے خارج نہیں بلکہ ہمارے تمثیلی اعتراض سے بھی شدید نہیں پھر ''ضلالت'' کیسی؟؟؟

لہٰذا ہم آپ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رفیق سفر بن کر چلیں تو آپ اپنا زادِراہ خود لیں اور آپ کا زادراہ دو چیزیں ہیں ایک نظر انصاف دوسرا تیقظ ۔ کیوں کہ جب کوئی شخص کوئی مخصوص نظر اور مخصوص نظریہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ حق وصدق تک نہیں پہنچتا پھر اسے نہ حق سمجھ میں آتا ہے نہ حق دکھائی دیتا نہ حق سنائی دیتا ہے ''لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا '' اور دوسری چیز عقل وشعور یعنی تیقظ اگر یہ بھی مفقود ہو جائے تو حقیقت واضح نہیں ہوگی ظاہر سمجھ سکتا ہے لیکن باطن نہیں لہٰذا تقیظ بھی ساتھ لے کر چلیں لیکن منزل پر خطر ہے لہٰذا تقیظ بھی اعلی اوسط اور ادنی میں سے اعلی لے کر چلیں ان شاء اللہ منزل دور نہیں ۔

تاویل کا راستہ یا اعتر ض کا انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے

جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ یہ ایک کج طبیعت کا دستور ہے کہ آدمی اپنے مخالف کی بات کو چاہے وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو اسے ٹھکرا دیتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اسلام کی بھی تعلیم یہی ہے؟ ظاہر ہے اسلام تو ہر درست اور حق بات کو کسی بھی جگہ سے لینے کی تعلیم دیتا ہے'' اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا '' (مشکوٰۃ ۳۴ عن ترمذی) کیوں کہ خود مذہب اسلام حق ہے اور حق پر قائم ہے اسی لیے ہم تو کہتے ہیں کہ اسلام اخلاق سے نہیں حق کی وجہ سے پھیلا ہے، یعنی وہ جتنا اخلاق سے پھیلا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ دنیا میں اس لیے پھیلا ہے کہ وہ سراپا حق ہی حق ہے!! لہٰذا آپ اسلامی اس نظریہ کو سامنے رکھ کر اور ہمارے مباحث پڑھ کر فیصلہ کیجیے کہ کسی مسلمان پر اعتراضات کا راستہ بہتر ہے کہ اقوال کی تاویلات کا ۔ ہم ذیل میں دو مثالیں ایک قرآن شریف سے اور ایک حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں ۔

اختصار کے ساتھ ہم یہ سمجھانا چاہیں گے کہ ایک قانون اور حکمت وبصیرت کے درمیان کتنا فرق ہے۔قرآن کریم میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس دو شخصوں کا جو مقدمہ آیا اس میں آپ نے اپنی سمجھ سے ایک ایسا درست فیصلہ فرمایا جو ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی سمجھ سے ایک دوسری بات کہی جو قانون کی بات تو نہیں تھی لیکن وہ ایسی عمدہ تجویز وتدبیر تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے بھی بڑھ کر تھی یہی بات قرآن نے کہی ہے ''فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ''(سورہ انبیاء ۷۹)۔

بہتری کی وجہ یہ تھی کہ یہ فریقین کے درمیان رضامندی سے صلح کی صورت تھی۔بس ہم یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرز عمل کی دعوت دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ کیا اعتراضات کا راستہ بہتر ہے جس سے دین برباد ہو یا تاویلات کا راستہ بہتر ہے جس سے دین محفوظ ہو، یہ انتخاب آپ کو اپنے لیے کرنا ہے۔خصوصاً کسی مسلمان کے غلط قول وفعل کی تاویل کی تعلیم وترغیب اسلام نے دی ہے،جس کی دلیل ذیل کی پیش کردہ حدیث شریف ہے۔یہ حدیث شریف چوں کہ اپنے مصدر سمیت حیاۃ الصحابہ میں ہے اس لیے ہم اس طویل حدیث کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں قارئین حوالہ سے مراجعت فرمالیں۔

واقعہ یہ بنا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت مالک بن نُوَیرہ رضی اللہ عنہ کو ''مرتد'' سمجھ کر قتل کروادیا باوجودیکہ انہوں نے مرتد ہونے کا انکار بھی کیا تھا، پھر ان کی بیوی سے شادی بھی کرلی۔جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے زنا کیا ہے اس لیے انہیں رجم کردیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس لیے رجم نہیں کرسکتا کہ انہوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس میں ان

سے غلطی ہوگئی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہوں نے ناحق قتل بھی کیا ہے اس لیے آپ بدلہ میں انہیں قتل کر دیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں انہیں قتل بھی نہیں کروں گا، کیوں کہ ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہیں معزول ہی کر دیں تو حضرت ابوبکر نے فرمایا جو تلوار اللہ نے کافروں پر سونتی ہے میں اسے کبھی بھی نیام میں نہیں کر سکتا (حیاۃ الصحابہ مترجم ۲/ ۷۵۴ از کنز العمال ج ۳ ص ۱۳۲)۔ دیکھیے رجم و قتل اور معزول تینوں امور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تاویل فرمائی۔ یہ اس قرآن شریف اور حدیث شریف کی دو مثالیں ہیں جنہیں ہم اور آپ مانتے ہیں، اب آپ فیصلہ لیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

چوں کہ اس مسئلہ کا تعلق عوام سے بھی ہے اس لیے ہم دو باتیں سمجھانے کے لئے ذیل میں شریعت یا فقہ کی بیان کردہ احکام مکلف کی قسمیں اور اس کا ایک منظر (نقشہ) پیش کرتے ہیں جو کتابوں میں ہے تا کہ عوام کو بھی اپنے دین و شریعت کی حفاظت کا احساس حاصل ہو۔

دین و شریعت کا ایک مختصر خاکہ

شریعت نام ہے پانچ چیزوں کی حفاظت کا۔

دین کی حفاظت   جان کی حفاظت   مال کی حفاظت   عزت کی حفاظت   ملک کی حفاظت

پھر دین نام ہے پانچ چیزوں کے مجموعے کا۔ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق۔ مکلف شخص پر عائد ہونے والے احکام کی اولاً چار قسمیں ہیں۔

(۱) خالص اللہ تعالیٰ کے حقوق: مثلاً نماز، روزہ، حج، زکات (کلمہ توحید)۔

(۲) خالص بندوں کے حقوق: مثلاً دوسرے کے مال کی حرمت۔

(۳) دونوں حقوق ہوں لیکن حق اللہ کی جہت غالب ہو۔ مثلاً حد قذف۔

(۴) دونوں حقوق ہوں لیکن حق العباد کی جہت غالب ہو۔ مثلاً قصاص۔

پھر پہلی قسم کی یعنی حقوق اللہ خالصہ کی ۸ اقسام ہیں۔

(۱) خالص عبادات : جیسے ایمان، نماز، روزہ، حج وزکات۔

(۲) عقوبات کاملہ: جیسے زنا، شراب، چوری، تہمت کی حدود۔

(۳) عقوبات قاصرہ: جزائیں جیسے قاتل مورث کی میراث سے محرومی۔

(۴) عبادت وعقوبت: جیسے تمام قسم کے کفارات۔

(۵) عبادت لیکن مع مؤنت: جیسے صدقہ فطر۔

(۶) مؤنت مع قربت : جیسے عشر۔

(۷) مؤنت مع عقوبت : جیسے خراج۔

(۸) حق قائم بذاتہ : جیسے مال غنیمت میں اور تمام معدنیات میں خمس۔

دوسری قسم یعنی خالص حقوق العباد تو وہ بے شمار ہیں۔ مثلاً

(۱) ضمان دیت (۲) تلف کردہ چیز کا ضمان

(۳) غصب کردہ چیز کا ضمان (۴) ملک مبیع

(۵) ملک ثمن (۶) ملک نکاح

(۷) ملک طلاق۔ وغیرہ (حسامی ۱۲۱)

یہ احکام جس طرح فقہ کے کہے جاتے ہیں اس طرح انہیں عدالتی قوانین بھی کہے جاسکتے ہیں۔ مختلف جرائم کے ارتکاب پر ان کا اجراء کیا جاتا ہے۔

نوٹ : یہ احکامات باوجودیکہ مقاصد شریعت ہیں لیکن یہی مقاصد نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی بڑا مقصد جب یہ احکام شرع خود لوگوں کی خواہشات میں ڈھل جائیں تو ان خواہشات اور دواعیٔ خواہشات سے نکال کر ان نصوص کے امتثال پر کھڑا کرنا ہے جن نصوص سے احکامات مستنبط ہیں

جیسے کہ قرآن حکیم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ’’ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ‘‘ (سورۃ مؤمنون ۷۱)۔(اصول الافتاء شیخ تقی عثمانی عن امام شاطبیؒ ۷۴)

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ شریعت پانچ چیزوں کی حفاظت کا نام ہے جس میں دین کی حفاظت بھی ہے۔ اور دین پانچ امور کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی دین کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ’’ تعلیم الدین ‘‘میں، دین کے پانچ اجزاء اس طرح بیان فرمائے ہیں۔ (۱) عقائد وتصدیقات۔ (۲) اعمال وعبادات۔ (۳) معاملات وسیاسات۔ (۴) آداب ومعاشرت۔ (۵) سلوک ومقامات (اخلاق)۔ (تعلیم الدین ص ۵)۔ ان میں سے پہلے دو نمبر کی چیزیں سب ہی جانتے ہیں جسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ رہے معاملات تو ان کا بیان بھی اوپر ’’حقوق العباد خالصہ‘‘ کے تحت سات نمبر تک میں ہو چکا ہے وہ معاملات کے قبیل سے ہیں اور مزید حکومت اور ملکی انتظام بھی شامل ہیں۔ (۳۲)۔

اور معاشرت کی تفصیل یہ کہ: کھانے پینے کے، لباس کے، سونے اٹھنے کے، مجلس کے، سلام کے، اجازت طلب کرنے کے، بات چیت کے، والدین واساتذہ کے، ہنسی دل لگی کے، مبارک باد کے، تعزیت کے، چھینک اور جمائی وغیرہ کے آداب ہیں (۵۰) (اولاد کی تربیت میں اسلامی کردار قسم اول ۱۸۵)۔ ولایت وسلوک کی تفصیل یہ ہے کہ: ولایت کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایمان وتقویٰ۔ پھر ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمان کامل۔ ایمان غیر کامل۔ اسی طرح تقویٰ کے بھی یہی دو درجے ہیں۔ لہٰذا ولایت کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک ولایت عامۃ، جو ہر مسلمان کو حاصل ہے دوسری ولایت خاصہ۔ جو مخصوص اشخاص کو حاصل ہوتی ہے۔ خاصہ کے لیے ایمان کامل اور تقویٰ کامل ضروری ہیں دیکھیے (نہج الائمہ فی اصلاح الامہ ۳/ ۸۸) پھر اس میں ریاضت کے مختلف اسباب مذکور ہیں (تعلیم الدین ۶۷)

ذکر کردہ ایمان، نماز، روزہ، حج، زکات آپس کے معاملات ومعاشرت اور اخلاق کی حفاظت کونسا شعبہ کرتا ہے غور کیجیے۔ کیا مدارس کرتے ہیں، خانقاہیں کرتی ہیں یا دعوت وتبلیغ؟ اگر کوئی شعبہ کرتا ہے تو کتنی کرتا ہے یہ بھی غور کرلیں۔ اور عوام اور افراد اپنے اپنے طور پر بھی غور کرلیں کہ ان مذکورہ تمام امور پر عمل وغیرہ کے ذریعہ تحفظ دین میں میری کتنی جدوجہد ہے۔ غور کرنے سے بالکل واضح ہو جائے گا کہ تحفظ دین میں ہمارا حصہ عشر عشیر جتنا بھی نہیں۔ یہ احساس دلانا پہلا مقصد تھا۔ تاکہ ہم اپنے متاع عزیز (دین) کو بربادی سے بچا سکیں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے دیکھ ہی لیا کہ اس کو دین بھی کہتے ہیں اور اسے شریعت بھی کہتے ہیں۔ ہمیں بتایئے کہ اس میں قرآن شریف کا اور سنت رسول (احادیث مبارکہ) کا ذکر کہا ہے؟ بالکل سیدھی بات ہے کہ ان کا ذکر کہیں بھی نہیں باوجودیکہ وہ تو تمام اصول کے لیے اصول ہیں تو یہ کتنے بڑے تعجب کی بات یا کہیں کتنے بڑے اعتراض کی بات ہے کہ ہم جس کو دین اور جس کو شریعت کہتے ہیں اس میں ہی قرآن شریف اور حدیث شریف کا ذکر نہیں۔ بس یہ سمجھنا تھا کہ جس طرح دین وشریعت میں قرآن وسنت کو نظر انداز کیا گیا ہے باوجودیکہ وہ ان کے مصادر ہیں اس طرح اگر مخصوص حالات میں کوئی کسی کو نظر انداز کرے وہ قابل گرفت اور قابل اعتراض شئی نہیں ہوتی۔ اگر اس کو سمجھ لیا ہوگا تو ان شاء اللہ آپ کو ہماری باتیں جلد سمجھ میں آجائیں گی۔

اگر کہا جائے کہ دین کی حفاظت مدارس کرتے ہیں اس لیے کہ دین کا علم وہاں پڑھایا جاتا ہے اور اگر کہا جائے کہ خانقاہیں کرتی ہیں اس لیے کہ وہاں تزکیہ کیا جاتا ہے اور اگر کہا جائے کہ دعوت وتبلیغ کا کام کرتا ہے اس لیے کہ وہ امت کو دین وایمان پر کھڑا کرتا ہے تو سب ہی شعبے بلا ترجیح دین کے محافظ ومعین ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی ہر شعبہ اپنی ترجیح پیش کرنے کا مجاز ہوگا۔

لیکن راقم باوجود یکہ تینوں شعبوں سے منسلک ہے اور نظر انصاف کا وعدہ کر کے آیا ہے کہتا ہے اگر گہرائی سے موازنہ کیا جائے تو بچند وجوہ دعوت وتبلیغ کی جدوجہد اپنی اخوات سے راجح ہوگی۔ پہلی وجہ یہ کہ علماء کا مقام بلند ہے وہ بلند مسند پر بیٹھ کر کام کررہے ہیں اس طرح مشائخ تصوف بھی بلند مرتبہ پر بیٹھ کر کام کررہے اس سے نیچے اتنا بڑا خلاء ہے کہ وہ کسی سے پر نہیں ہوتا اس کو پر کرنے کے لیے نیچے آنے کی ضرورت ہے جو ان سے ممکن نہیں چناں چہ دعوت وتبلیغ نے نیچے رہ کر اس خلا کو پر کیا۔ جس کو عمومیت وشمولیت کہیں یعنی یہ کام امت اور افراد امت کے لحاظ سے عام ہے یہ ایک وجہ ہے۔ دوسری وجہ یہی عمومیت اور شمولیت لیکن افراد امت کی نہیں جو پہلے میں تھی بلکہ دینی عمومیت یعنی دین کے اکثر اجزاء میں کام کا اثر دکھانا، ایسا اثر جس سے دین وایمان کی حقیقت پیدا ہوجائے، جس کے نتائج تمام دنیا نے دیکھ بھی لیے یعنی یہ کام دین کے لحاظ سے بھی عام ہے۔

برخلاف مدارس وغیرہ کے وہاں صرف علم پڑھایا جاتا ہے۔ تیسری وجہ اس حدیث شریف کے تقاضہ سے ثابت شدہ دعوت الی الہدایت ہے ''مَنْ دَعَا اِلٰی هُدًی کَانَ لَهٗ مِنَ الاَجْرِ مِثْلُ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ ۔۔۔ (مشکوۃ ۲۹) کیوں کہ دعوت کا اجر اس کے غیر کے مقابلہ زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے ''وَبِهٰذَا یُعْلَمُ اَنَّ لَهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِن مُّضَاعَفَةِ الثَّوابِ ... وَکَذَا السَّابِقُوْنَ ... وَکَذَا بَقِیَّةُ السَّلَفِ بِالنسبَةِ اِلَی الخَلَفِ وَکَذَا العلماءُ المُجْتَهِدُوْنَ۔۔ (مرقات ۱/ ۲۳۳)۔

(⬅) چوتھی وجہ جو سب سے بڑی ہے وہ ہے دعوت وتبلیغ کی بنیاد۔ پورے دعوت کی بنیاد یقین کی صحت اور اس میں ترقی ہے اور یہی مذہب کی بھی بنیاد ہے جو کسی کے پاس نہیں اور خود احادیث میں اس کا ذکر ہے۔ حدیث شریف میں ہے ''اَلیقِینُ الاِیمَانُ کُلُّه''

(احیاء علوم الدین ۸۷/ج ۱ عن بیہقی) یعنی یقین کو کل ایمان یعنی ایمان کامل بتایا گیا ہے۔ بلکہ دوسری حدیث میں اسے حاصل کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے "تَعَلَّمُوْا الیَقِیْنَ" (ایضاً عن ابونعیم) اسی وجہ سے جماعتیں مسجدوں میں مجلس کے لیے اعلان بھی یہی کرتی ہیں کہ "نماز کے بعد ایمان ویقین کی بات ہوگی" ایک اور حدیث میں یقین کا تذکرہ ہے "اَوَّلُ صَلاحِ ھٰذِہِ الاُمَّۃِ بِالیَقِیْنِ وَالزُّھْدِ" کہ اس امت کی اصلاح کی ابتدا یقین اور دنیا سے بے رغبتی سے ہوئی ہے (بیہقی ۷/۴۲۷)۔ ایک دوسری حدیث میں ایمان کا ذکر ہے۔ وقال رسول اللہ ﷺ: اَفْضَلُ الاَعْمَالِ عِنْدَاللّٰہِ اِیْمَانٌ لَاشَكَّ فِیْہِ" (دارمی ۲/۲۱۶)۔ آپ بتایئے سوائے دعوت وتبلیغ کے کونسی محنت ہے جس کی یہ بنیاد ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث مبارکہ میں اسی زمانہ میں اس محنت کی آں حضرت ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے اور امت کو اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔ (➡) خلاصہ یہ کہ یہ کام ایک تو تمام افراد امت پر حاوی ہے اور دوسرا یہ کہ پورے دین پر حاوی ہے اور تیسرا یہ کہ اجر کثیر کا ذریعہ ہے چوتھا یہ کہ اس کی بنیاد ایمان ویقین ہے جس کی وجہ سے بجا طور پر وہ قابل ترجیح ہے۔

یہی وہ وجہ ہے جسے حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ سے تاہنوز بڑے بڑے وہ علمائے دیوبند جو حقیقت سناش تھے یا ہیں اس کے قائل رہے، نباض علماء کی فراست وتشخیص غلط ظاہر نہیں ہوتی۔ باوجودیکہ یہ کام ایک جدید سا تھا اور اس کی بعض جہتیں قابل تسلی نہیں تھیں مثلاً آیات جہاد وقتال وغیرہ۔۔۔ (⬅) اسی لیے تو خود حضرت شیخ زکریاؒ کو مختلف اعتراضات کے جواب دینے پڑے اور کتاب لکھی (تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات) اور یہی بات حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب نے بھی لکھی ہے۔ لکھا ہے کہ "بڑے حضرت جی کی باتوں پر بڑے بڑے علماء کو اشکالات ہوتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔۔۔۔ (مکاتیب حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب ۴/۳۲۴)۔ (➡) لیکن فی الجملہ اس کی صداقت

وحقانیت کا دل وجان سے اعتراف کیا، جب کہ ابھی تو کام کی کمزور شکلیں نظر آرہی تھیں لیکن بعد میں تو کام اپنی پوری توانائی کے ساتھ اٹھا کہ پھر تو خدا نے نتائج ایسے دکھائیں گویا، گویا ''اِذَا جَاءَ نَصرُ الله . . یَدْخُلون فِي دِیْنِ الله اَفواجاً'' کا منظر سج گیا۔ اب تو عینی مشاہدہ اور تجربہ بھی کام کا مؤید بن گیا اور یہ دونوں یعنی حسیات وتجربیات، بدیہیات میں سے ہیں اب تو اس کا انکار بداہت کے انکار کے مرادف ہے۔ خلاصہ یہ کہ احیاء دین کی تاثیر میں اور عام امت کے حق میں مفید ہونے میں دعوت کا شعبہ بقیہ سے راجح ہے۔

لوگوں کا ردعمل

دعوت وتبلیغ کے میدان میں پیش آمدہ مسئلہ کے نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مختصر یہ کہ ہر کسی کے دینی احوال متأثر ضرور ہوئے جس کی عادت جھوٹ بولنے کی، چغلی کرنے کی، کینہ کی، تجسس کی، نفرت وعداوت کی، غیبت کی، تہمت وغیرہ وغیرہ کی نہیں تھی وہ عادت اس المیہ کے پیش آنے سے بن گئی۔ اور جو لوگ ایمان ایمان، اللہ اللہ، حضور حضور، دین دین اور اخلاص اخلاص زندگی بھر بولتے تھے ان کے اخلاص ودین کا امتحان ہوگیا۔ کہنے سے ڈر لگتا ہے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو بے دینی کے راستے اور کھلے گناہوں کے راستے برباد ہوں! لیکن بدقسمت ہیں وہ لوگ جو دین کے راستے برباد ہوں۔ ایسی مثال نہیں دیکھی کہ جس دین سے نجات کی آس لگائے ہوئے تھے اسی دین سے ہلاکت وبربادی ملے لیکن اب دیکھ لی۔ ''وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ''۔

دراصل اس میں بڑا کردار میڈیائی آلات، نیٹ اور واٹ ساپ کا رہا، کیوں کہ لوگوں نے اپنی تمام تر خرابیوں مثلاً چغلی، تجسس، حسد، کینہ، تہمت وغیرہ کا پیراہن اتار کر انہی کو پہنا دیا،

اب نہ جسم پاک نہ لباس پاک، دونوں نے پیٹ بھر کر شر وفساد کے پھیلانے میں اس قدر حصہ لیا کہ ''يُصْبِحُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا'' کی طرح کس کی بات درست اور کس کی بات نادرست سمجھنا بھی دشوار ہو گیا اور اعتماد کو اٹھا دیا حتی کہ بعض بڑی شخصیات کو ان کی جانب غلط نسبتوں سے دیے بیان کی صفائی دینے کی ضرورت پیش آئی۔

اس کی وجہ سے دین اور بڑے بڑے متدین حضرات کی ناقدری ہوئی، علماء عظام و دینی شخصیات، اکابر دعوت وتبلیغ کے خلاف لوگوں کی بے جا جسارتیں، جرأتیں اور زبانی وتحریری بے باکیاں ان کی تغلیط، ان پر بے دین اور بد دین ہونے کے الزامات سب منظر عام پر آ گیا، اور اتنا آیا اتنا آیا کہ ایک باشعور اور حساس مزاج شخص کو اپنی آنکھوں، زبانوں کو قصداً بند کرنا پڑا، قصداً چشم پوشی سے کام لینا پڑا۔ بنا بنایا دین پامال ہو گیا۔ معروفات سمندر کی سمت جا کر غرق آب ہو گئے اور منکروت سمندر اور بیابان وجنگل سے نکل نکل کر لوٹ آئے جنہیں صدیوں پہلے زمین میں دفن کر دیا گیا تھا گویا زمانۂ جاہلیت لوٹ آیا۔ الامان الامان۔ معلوم ہوتا ہے وہ زمانہ عزلت آ گیا جس کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اسی لیے ہم نے مذکورہ بالا نقشہ تحریر کیا ہے تا کہ اس پر غور کے بعد لوگوں کو احساس ہو کہ وہ دین کے محافظ زیادہ ہیں یا ان مذکورہ راستوں سے دین کو ضائع کرنے والے زیادہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراض کا حال

جس عظیم تحریک کا کچھ فاصلہ پر تذکرہ گزرا ہے اس کا ایک پاسبان اور عظیم سربراہ حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ جن پر ان کے بیانات کی کچھ باتوں سے اعتراضات ہوئے ہیں؟ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اسے بھول کر اس طرف نظر ڈالیے کہ ہم اہل

السنہ والجماعہ کے دین کے معروف ومشہور شعبوں کے جتنے علمبر دار ہوئے ہیں چاہے وہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بانی، مہتمم اور تصوف کے مشائخ اور جمعیت علمائے ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ، وغیرہ کے صدر حتی کہ تقسیم ملک کی تحریک کے دونوں طرف کے علماء حضرات وغیرہ ان سب پر کیا کیا احوال پیش آئے۔ ان سب کو دیکھ کر ایک فیصلہ تو ہر سمجھدار مسلمان یہ کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسند پر اسی کو بٹھایا تھا، یا بیٹھایا ہے جس کی ضرورت تھی کیوں کہ ان سے وہ کام درست طور پر انجام پاگیے گویا جو اللہ کو منظور تھے۔

اور دوسرا فیصلہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دیوبند کی پوری تاریخ میں ایک سربراہ بھی ایسا نہیں آیا جس پر گمراہی کا الزام اور راہ راست سے ہٹنے کا داغ اس پر لگا ہو، گویا اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتے کہ اہل السنہ والجماعہ پر کوئی دھبہ لگے۔ باوجودیکہ مدارس اور جمعیت اور تقسیم ملک کے مسئلہ میں علماء عظام میں کافی حد تک حالات تشویش ناک بن چکے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ تمام مناصب کے مالک علماء حضرات مسند کے لائق ہی منتخب ہوئے اور حالات کی کشاکش کے باوجود مطلوب کام بھی انجام پایا اور الزامات سے بے داغ بھی رہے۔ اللہ ہمارے ان تمام علماء کرام کو جزائے خیر نصیب فرمائیں بلکہ ان کے صدقے ہمیں بھی بخشدے تو بس مسئلہ پیش آمدہ میں بھی اطمینان رکھنے کی ضرورت ہے ان شاء اللہ یہاں بھی وہ ہی حال ہوگا۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے بیانات کی کل مدت اگر جوڑی جائے تو تقریباً بیس سال بنے گی جو مستقل ایک حیرت کی چیز ہے۔ اور اس سے بڑی حیرت کی چیز یہ کہ ہم اہل مدارس کے لیے مخصوص عملہ ہوتا ہے جو مشاہرہ پر کام کرتا ہے۔ تبلیغ کے پاس کام کرنے کا کوئی عملہ نہیں، نہ کوئی ان کا وظیفہ ہے اور کام پوری دنیا میں انجام دیتا ہے، غور کی بات یہ ہے کہ اس حیرت ناک کارنامہ کی طاقت کہاں سے مل رہی ہے!! ظاہر ہے کہ یہ طاقت انہیں انہی بیانات سے

حاصل ہورہی ہے۔لہٰذا اتنے طویل عرصہ کے بیانات میں کچھ اونچ نیچ ہوجائے یہ ممکن ہے مولانا بھی ایک بشر ہیں لہٰذا مذکورہ بالا چیزوں کو اگر ملحوظ رکھا جاتا تو جو بات پیش آئی ہے وہ اس قدر بڑی نہ ہوتی۔ہمیں چاہیے تھا اس اونچ نیچ کو ہم درست کر لیتے اور ہم ہی اسکے تانے بانے کو جوڑ لیتے۔

ورنہ اگر ہم ارادہ کرلیں کہ بس گرفت کرنا ہے،تو دنیا میں کوئی مقرر ایسا نہیں جس کی بات پر گرفت نہ کی جاسکے جب کہ عام مقررین کا حال یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے اوقات طے ہوتے ہیں،عنوانات متعین ہوتے ہیں جس سے تقریر کی تیاری پیش گی کرلی جاتی ہے اور تقریر بھی ایک گھنٹہ تقریبا،تبلیغ میں ایسا نہیں ہوتا وہاں تو ایک گھنٹہ کبھی دو تین گھنٹہ،اور وہ بھی مہینہ دو مہینہ نہیں سال دو سال نہیں پورے بیس سال،تو اس میں کچھ کوتاہی ہوجائے یہ ضرور ممکن ہے۔ درحقیقت ناراضگی کا بیج پہلے سے ڈال دیا گیا ہو تو پھر اعتراضات کی لڑی خواہ مخواہ ستر عدد تک دراز کرنے میں تعجب کی بات نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ کسی کی بات پر اعتراض اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ،وہ تو انتہائی آسان کام ہوتا ہے،کیوں کہ اعتراض یا سوال عامۃً کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتا اور نہ اس کا اعتماد حکمت وبصیرت پر ہوتا ہے۔مثلاً کوئی کہہ دے کہ فلاں نے ایسا کیوں کہا،ایسا کیوں کیا ؟ سوال بن گیا۔ برخلاف جواب کے کہ اس میں لمبے چوڑے دلائل مطلوب ہوتے ہیں۔اس لیے سائل کا ہر سوال قابل توجہ نہیں ہوتا۔

دراصل حضرت مولانا محمد سعد صاحب مرور زمانہ سے دعوت وتبلیغ میں داخل شدہ مفاسد کو بسبیل حکمت وبصیرت دور کرنا چاہتے ہیں جن مفاسد کو لوگ اس لیے سمجھ نہیں پارہے ہیں کہ انہیں کام سے اور کام کرنے والوں سے حسن ظن اور عقیدت ہے حالاں کہ وہ مفاسد کام کے حق میں جان لیوا ہیں مثلاً: کام کو رسمیت سے اور جد وجہد چھوڑ کر عیش طلبی سے انجام دینا،صرف بیانات سے کام کی چاہت رکھنا،اکرام واحترام میں مبالغہ کرنا،اصاغر واکابر میں اور علاقیت وغیرہ میں غیر مستحسنہ تفریق برتنا اور کام کو صرف بنیت برکت کرنا وغیرہ۔

حضرت مولانا لوگوں کی سمجھ سے اوپر کی گہری باتیں بار بار کہہ کر '' اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا '' ان پر سوار اس غلط نشہ کو اتار کر انہیں ہوش میں لانا چاہتے ہیں تا کہ لوگ خود ہی ان گہری اور کڑی باتوں پر عمل کر کے ان مفاسد کو دور کریں اور کام کی سطح کو بھی بلند کریں اس طرح لوگوں کو ٹوکنے کی بھی ضرورت نہ پڑے اور سانپ بھی بلا لاٹھی ٹوٹے مرجائے۔ یہ ہے حقیقت اگر آپ اپنی بصیرت سے سمجھنا چاہیں! لیکن ہوا یہ کہ لاٹھی ٹوٹ گئی اور سانپ نہیں مرا لیکن چوں کہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی مرضیات سے کام انجام پاتے ہیں یقیناً اس میں کوئی راز وخیر مخفی ہیں۔ آیئے اب ہم بنظر انصاف وجوہ اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

وجوہ اعتراضات

وجوہ اعتراضات پر غور کرنے کے ضمن میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اصلاً لوگوں کی سمجھ سمجھ کا فرق ہے اور یہ تو عقل کی بحث سے معلوم ہو ہی چکا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے وہ اقوال ایک بڑی جماعت کو سمجھ میں نہیں آئے جن پر اعتراضات وارد کیے گئے تو سوال یہ ہے کہ پھر دوسری بڑی جماعت کو کیوں سمجھ آئے اور انہوں نے کیوں اعتراضات نہیں اٹھائے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر تشویش گمراہی کے الزام کے باوجود انہیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا؟ باوجودیکہ دونوں جماعتوں میں عوام کے ساتھ علماء بھی ہیں۔ معلوم ہوا کچھ تو بات ہے اسی لیے ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ کوئی بھی قصداً اقصور وار نہیں ہے۔ صرف سمجھ کا فرق ہے لہٰذا پہلے وجوہ اعتراضات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

بایں وجہ پہلا مسئلہ ان جملوں کے معنی سمجھنے کا ہے کہ ان کا معنی ان کی مراد کیا ہے؟ تو اس میں دو جماعتیں بنتی ہیں۔ ایک جماعت یہ خیال کرتی ہے کہ وہ جملے مع اپنے معانی درست ہیں۔ اور دوسری جماعت یہ خیال کرتی ہے وہ جملے مع ان کی معانی درست نہیں بلکہ قابل اعتراض

ہیں۔ یہاں پہنچ کر ہم قطعی طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ پھر فرق لوگوں کی سمجھ کا ہے جس سے دو جماعتیں بنتی ہیں ۔ کیوں کہ ایک جس کو درست کہتی ہے دوسری اسی کو نادرست کہتی ہے تو بات بالکل واضح ہے کہ سمجھ کا فرق ہے ۔ اور درست کہنے والی جماعت کا مسئلہ خارج از بحث ہے ۔ کیوں کہ انہیں تو مولانا کی باتیں درست سمجھ آ رہی ہے چاہے کسی عالم کی طرف رجوع کرنے سے ہو یا ازخود مولانا کے بیانات کے سیاق وسباق میں تطبیق دینے سے ہو یا حضرت مولانا پر اعتماد کر لینے سے ہو۔

البتہ نادرست سمجھنے والی جماعت کا مسئلہ قابل بحث ہے کہ ان کی سمجھ کیوں نادرست کہتی ہے۔ تو یاد رکھیے نادرست کہنے کی بھی کئی وجوہات اور کئی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

الف : حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے عدم اعتماد بالفاظ دیگر ذاتی دلی خرابی کی وجہ سے ہو کہ وہ صحیح سمجھنے کو قصداً نظر انداز کریں، یعنی سمجھنا ہی نہ چاہیں نہ ازخود نہ ان علماء حضرات سے جو انہیں سمجھا کر مطمئن کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا یہ عدم اعتماد یا دل کی کھوٹ صرف ان کی ذات تک محدود ہو۔

ب : یہ بھی عدم اعتماد والے ہیں لیکن ان کی دلی خرابی صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہو بلکہ اشتعال پسندی بھی شامل ہو جس کی وجہ سے وہ مولانا کی بات کو غلط معنی پہنا کر دوسری ایسی تعبیر میں پیش کریں جس سے اعتراض اٹھے ان کی طبیعت میں دوسروں کو بھڑکانا شامل ہو۔ یہ اول قسم سے زیادہ سنگین ہے، کیوں کہ اول میں شر ہے لیکن دعوت الی الاثم نہیں ۔ اور اس میں شر ہونے کے ساتھ دعوت الی الاثم بھی ہے۔

نوٹ : یہ بات فراموش نہ کی جانی چاہئے کہ کسی قدر بڑے آدمی کی زندگی میں بہت سے مواقع اس کے محسبین و متعلقین کی جانب سے عقیدت میں دعوت الی الاثم اور تعاون علی الاثم کے سامنے آتے ہیں جس کا تجربہ ہر باشعور بڑے آدمی کو ضرور ہوگا۔ اب بوجہ خوف خدا و تیقظ وحکمت

اس سے بچاؤ کرلیا جاتا ہے اگر ان میں خوف خدا غالب ہو یا پھر غلبۂ محبت وعقیدت اور قلت تیقظ وخوف کی وجہ سے اس پر اقدام کرلیا جاتا ہے جس سے ایسی جگہ سے شر وفساد برپا ہوتا ہے جس کا واہمہ بھی لوگوں کو اس کے علومرتبہ کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہاں ایسا ہوا ہو خلاصہ یہ کہ بڑا رتبہ ایک سخت آزمائش کی چیز ہے لہٰذا اس سے بچنے کا بھی اہتمام ہو اور سمجھنے کا بھی اہتمام ہو کہ ہم اسے سمجھیں۔

ج : تیسری قسم ناسمجھی کی کمی والوں کی ہے، دل صاف ہو لیکن یہ فیصلہ نہ کرسکیں کہ بات درست ہے یا نادرست لیکن اپنے ہم نشینوں کے ساتھ ہو جائیں۔

کسی کے کلام کو نہ سمجھ سکنا یہ ممکن ہوتا ہے اس کی ہم حدیث شریف سے مثال دیتے ہیں آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''مَنْ قَرَا اٰيَةَ الْكُرْسِيِّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ اِلَّا الموتَ'' یہاں معنی متعین کرنے میں دقت ہوسکتی ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں تو موت کو دخول جنت سے مانع بتایا گیا حالاں کہ سمجھ کہتی ہے وہ تو دخول جنت کا سبب ہے نہ کہ مانع تو اس کا حل کئی طرح سے نکالا گیا ہے۔

(۱) اِلَّا المَوْت بمعنی اِلَّا عَدَمَ المَوْتِ (بتقدیر مضاف)۔ (۲) قال الطیبی رحمۃ اللہ علیہ الموتُ حَاجِزٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ دُخولِ الْجنةِ۔۔۔ یعنی موت آدمی اور دخول جنت کے درمیان مانع ہے لیکن اس کا تحقق ہو جائے تو پھر دخول جنت سے مانع نہیں۔ (۳) ''قَالَ عَلِي القَارِي۔۔۔ الا اَن يَّمُوْتَ كَافِرًا'' بتقدیر حال اور یہ تاکید المدح بمایشبہ الذم کے قبیل سے ہے جیسے کہ آیت قرآنیہ میں ''وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللهِ۔۔۔ (مرقات ۲/ ۳۶۸)۔

معلوم ہوا کہ کسی کی بات میں سمجھنے اور نہ سمجھ سکنے کا احتمال رہتا ہے۔

اس قسم کی بھی دو قسم ہوسکتی ہے فتدبر: اس قسم کا مسئلہ بھی خارج از بحث ہے۔ سنگین مسئلہ دوسری قسم کا ہے کہ شاید انہوں نے اولاً حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے خلاف ہوا چلائی

اور بڑی مضبوط تدبیر سے اپنے ارادہ کی کامیابی حاصل کی وہ تدبیر یہ کہ ازخود آواز اٹھاتے تو وہ ماری جاتی لہٰذا انہوں نے اسے دار العلوم اور دار الافتاء تک پہنچادیا اور سارے الزامات سے اپنے کو بچادیا اور مسئلہ کا بیڑا دار الافتاء نے اٹھالیا، پھر مسئلہ اس طرح زور پکڑ گیا کہ اُمت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

نوٹ : ہم اپنی نظر انصاف اور مؤمنین سے حسن ظن کو قائم رکھتے ہوئے یہ بھی ضرور کہیں گے کہ پہلی اور دوسری قسم پر ہم نے شر کا اور شر پسندی کا الزام لگایا ہم خدا سے اور ان حضرات سے بھی معافی چاہتے ہیں کہ اگر واقع میں وہ ایسے نہ ہوں تو ہم غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے جو کام کیا وہ صالح نیت اور صالح ارادہ سے کیا ہو لیکن نتیجہ سامنے آنے کے بعد اتنی بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ اقدام امت و دین کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ اور ہم نے جو کہا وہ ایک احتمال کی فہرست میں یقینی طور پر آنے کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تعیین معنی میں خطا کی وجوہات

یہ بات ذہن نشین ہو کہ ہر انسان سے خطاء ونسیان کا صادر ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کا وقوع گاہے گاہے ہوتا ہے جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ پھر چاہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب ہوں اپنے اقوال میں یا دونوں طرف کے علماء حضرات ہوں اقوال کے معنی متعین کرنے میں یا دار العلوم دیو بند کے علماء حضرات ہوں اپنے فتویٰ میں یا راقم الحروف ہو اپنی باتوں میں یا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے علاوہ اکابر دعوت وتبلیغ ہوں اپنے طرز عمل میں۔ زیر بحث مسئلہ خطاء ونسیان کا نہیں ہے۔ مسئلہ ہے اس کا کہ کون سے کام میں کتنا ارادہ اور کیسا ارادہ شامل ہے؟ کیوں کہ پورا مسئلہ انہی پر متفرع ہے۔ اور صرف قصد ہی نہیں، قصد کے ساتھ مسئلہ ہے تیقظ و بیداری اور احتیاط سے کام لینے کا کہ کس نے کتنے تیقظ سے اور کتنے احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ نتیجہ

کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ارادہ کی خرابی یا احتیاط وتیقظ کی کمی زیادتی نے مسئلہ کو متاثر کیا ہے۔
یہاں بھی کئی احتمالات بنتے ہیں۔

الف : قصداً خطاء کا ارتکاب کرے یعنی حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی غلط تعبیر کرے اور غلط معنی پہنائے۔ ہمارے دین واسلام کا تقاضہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم یہ الزام اپنے کسی مسلمان بھائی پر عائد کریں۔ لیکن احتمال کا تقاضہ اور دور انحطاط کا تقاضہ اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کے نقصان کے پیش نظر یہی احتمال غالب نظر آرہا ہے۔ اگر فی الواقع یہی ہوا ہے تو اس قسم کے لوگ اپنے سوء ارادہ کی وجہ سے ''شاید'' حق کے دلائل کے بعد بھی اسے تسلیم نہیں کریں گے اگر اللہ توفیق دے تو الگ بات ہے، بس انہیں خدا سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔

ب : قصداً تو خطاء کا ارتکاب نہ کیا ہو لیکن پھر بھی ناسمجھی سے خطا کو درست سمجھ لیا ہو۔ تو یہ لوگ معذور ہیں لیکن جب تک دلائل سے حق واضح نہ ہو جائے۔ اگر اس کے بعد بھی حق کو نظر انداز کریں تو پھر معذور نہیں۔

ج : حضرت مولانا کے اقوال کے تعیین معنی میں خطا کا واقع ہونا، عدم تقیظ، غلو فی الاحتیاط اور دعوت وتبلیغ کی حقیقت (واقعیہ) سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور اپنی ذہنی تحفظات وجمود پر اعتماد کی وجہ سے ہو ان علوم قرآن وحدیث کی وسعتوں اور بلندیوں کو فراموش کر کے جن کی بلندی اور وسعت آسمانوں کے برابر ہیں جس کی وجہ سے ظاہری الفاظ سے جو ظاہری معنی مفہوم ہوئے وہی مراد سمجھ کر باعث اعتراض اور خلاف شرع تصور کیا ہو یہ اگر عوام کی جانب سے یا عام علماء حضرات کی جانب سے ہو تو کم خطرے کی چیز ہے لیکن بڑی مسندوں کے حامل علماء حضرات کی جانب سے ہو (جیسا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں ہوا ہے) تو بڑے خطرے کی چیز ہوگی کیوں کہ یہ ''مطلق'' خطاء میں شامل نہیں۔ فتدبر۔

تعیین معنی میں سب سے مقدم اور بہتر طریقہ

جب قائل کی کوئی بات (یا فاعل کا فعل) بظاہر شریعت سے منحرف نظر آئے تو اس کی مراد اور معنی کی تعیین میں کئی طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔لیکن ان تمام طریقوں میں مقدم اور بہتر طریقہ خود قائل وفاعل کی طرف مراجعت کا ہے کہ خود اسی سے مراد پوچھی جائے جس میں دوسرے معانی محتملہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور مراد کلام صاف بے غبار ہوکر واضح ہوجاتی ہے۔اس سے صحیح معنی کا تعین ہوگا۔یہ طریقہ نہ صرف عقلی طور پر مقدم اور بہتر ہے بلکہ شرعی طور پر ثابت اور مطلوب ہے۔

ہم اس کی مثال بلاغت کے ایک واقعہ سے اشارۃ پیش کرتے ہیں حجاج بن یوسف اور قبعثری کا واقعہ: قبعثری نے کہا تھا:'' اَللّٰھُمَّ سَوِّدْ وَجْھَہٗ وَاقْطَعْ عُنُقَہٗ وَاسْقِنِی مِنْ دَمِہٖ '' اے اللہ اس کے چہرے کو سیاہ کردے اور اس کی گردن کاٹ دے اور اس کا خون مجھے پلادے۔جب اس کی خبر خلیفہ حجاج کو پہنچی تو قبعثری کو بلا کر پوچھا کیا تو نے یہ کہا ہے؟ تو اس نے کہا ہاں لیکن آپ کے بارے میں نہیں انگور کے بارے میں کہا ہے تو حجاج نے کہا ''لَاَحْمِلَنَّکَ عَلَی الْاَدْھَمِ۔۔''

مختصر المعانی میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔مخاطب سے صادر کلام کو اس کی مراد کے خلاف پر محمول کیا گیا ہے۔مطلب یہ کہ کوئی شخص اپنی مراد پر کلام کو ڈھال کر کسی کو مجرم بھی ٹھیرا سکتا ہے پھر اسے سزا دے سکتا ہے تو دوسرا شخص یعنی مجرم اپنی مراد پر کلام کو ڈھال کر قید وقتل سے نجات بھی پاسکتا ہے (مختصر المعانی ۱۲۶)۔واقعہ سے معلوم ہوا کہ معنی ومراد کے بدلنے سے آدمی سزا سے بچ سکتا ہے۔تو غور کی بات یہ ہے جب کوئی سزا سے بچ سکتا ہے تو کسی کی مراد کو درست بتا کر گمراہی سے کیوں نہیں بچایا جاسکتا۔اگر متکلم کے علاوہ قول کی مراد متعین کرے تو اس میں خطا کا احتمال ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔جس کو بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ

الف: اگر کوئی کسی کا قول تاویل کرانے کے لیے لائے تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر جانتا ہو اور بنظر انصاف تاویل کرسکتا ہو تو کرے ورنہ خاموش رہ کر دوسرے کے حوالے کردے۔ اب جس کے حوالے ہوا اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

ب : ایک یہ کہ بنظر انصاف تاویل کرے۔

ج : دوسری یہ کہ بنظر انصاف نہ کرے بلکہ غرض فاسد کی وجہ سے خیانت کرے اور غلط تاویل کرے۔ اگر غلط تاویل خیانت سے کرے تو اس کا نقصان تو ظاہر ہے۔

د: بنظر انصاف تاویل کرے لیکن پھر بھی بعض حالات میں نقصان ہوتا ہے کیوں کہ تاویل کرنے والا اگرچہ بنظر انصاف یعنی صالح ارادہ سے کررہا ہے " اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ " لیکن معاملہ کی سنگینی کو وہ نہیں جانتا جس کی وجہ سے صالح ارادہ کے باوجود وہ انجام کے اعتبار سے شر بن جاتا ہے جس کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر " وَلٰكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ " سمجھایا ہے۔ لہٰذا دوسرے کی تاویل میں شر کا پہلو غالب ہے۔ شاید پیش آمدہ مسئلہ میں یہی صورتیں پیش آئی ہیں۔ (واللہ اعلم)

ماسبق کے تین عنوانات کا حاصل :

اگر کوئی شخص پیش آمدہ مسئلہ میں خرابی کا سراغ لگانا چاہے تو ہم نے ان تین عنوانات میں اشارہ کردیا ہے، اسے چاہیے کہ صورت حال کا تجزیہ تین عنوانات میں اس طرح کرے کہ وجوہ اعتراضات کے تحت تین احتمالات تھے، دل کی خرابی، دل کی خرابی مع شر پسندی۔ ناسمجھ لوگ لیکن وہ بھی ان کے ساتھ۔۔۔ تعیین معنی میں خطا کے تحت تین احتمالات تھے، قصداً خطا کرنے والے۔ خطا کو درست سمجھنے والے، عدم تیقظ کی وجہ سے صحیح مراد نہ پانے والے۔۔۔ مقدم اور بہتر طریقہ کے

تحت چار احتمالات تھے، جس میں سے ایک بنظرِ انصاف تاویل نہ کرے، دوسرا بنظرِ انصاف کرے لیکن ناسمجھی کا شکار ہو جائے۔ یہ ساری وہ صورتیں ہیں جن سے معاملہ فساد وفتنہ کی شکل اختیار کر جائے بلکہ کر گیا، یہیں سے معاملہ کا سراغ ہاتھ لگتا ہے کہ معاملہ میں کہاں کیا ہوا ہے اس میں کس کی جانب سے کتنے ارادۂ بد اور خیانت کا دخل ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہم نے شروع ہی میں لکھا ہے کہ یہ سب امور باطنہ ہیں نہ کسی کا تزکیہ درست ہے نہ کسی پر الزام درست ہے۔ (واللہ اعلم)

رجال دین کے قابل اعتراض چند اقوال

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی وہ صحیح تاویل نہیں ہوسکتی جس کے آپ متمنی ہیں بلکہ وہی موقف صحیح ہے جو دار العلوم دیوبند نے اختیار کیا ہے، تو پھر ہم یہ بھی پوچھیں گے کہ حضرت مولانا کے اقوال کی تاویل نہ ہوسکنے کی وجہ کیا ہے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ وہ اقوال خلاف شرع ہیں، اور بھلا خلاف شرع کی تاویل کیسے ممکن ہے!!؟ تو اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ پھر آپ ذیل میں ہمارے ذکر کردہ رجال دین کے اقوال میں بھی ہتھیار ڈالدیں گے کیوں کہ وہ بھی ایسے ہی خلاف شرع ہیں پھر تو آپ ان رجال دین پر بھی وہی حکم ''اندیشۂ ضلالت'' لگائیں گے۔ نعوذ باللہ منہ۔ جو حضرت مولانا محمد سعد پر لگایا ہے؟ ظاہر بات ہے وہ حکم نہیں لگا سکتے۔

دوسرا احتمال : یہ ہے کہ ذیل کے اقوال مشائخ میں تو تاویل کریں گے۔ کیوں کہ وہ حکم ممکن ہی نہیں۔ تو ہم پوچھیں گے کہ تفریق کی وجہ کیا ہے؟ دیگر کے اقوال میں تاویل اور مولانا کے قول میں ترک تاویل۔ یہ کیسی ناانصافی ہے پھر تو خیانت وناانصافی کی وجہ سے عند اللہ ماخوذ ہونا موافق شرع ہے۔ (⬅) کیوں کہ اگر چہ رجال دین بڑے ہیں بمقابلہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب لیکن غیر معصوم ہونے میں تو سب برابر ہیں (اور حکم لگانے کے لیے کسی بھی جہت سے اتحاد کافی

ہوتا ہے) اسی لیے بعض سلف نے فرمایا ہے کہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے وہ تو سب قابل قبول اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہو ان میں سے کچھ قبول اور کچھ متروک اور جو حضرات تابعین سے منقول ہو اس میں '' نحنُ رجالٌ وَھُمْ رِجالٌ ''۔۔۔ (احیاء علوم الدین ۸۴؍۱ بیان علماء الاخرۃ علامت ۱۱)۔ (➡) چوں کہ ہمیں اپنے علماء حق کے بارے میں اس کا پورہ یقین ہے کہ وہ مذکورہ خیانت وتفریق اختیار نہیں کرسکتے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال تاویل کے قابل ہیں اور جب تاویل ممکن ہے تو ان پر نہ اعتراضات درست ہیں نہ وہ حکم جو ان پر لگایا گیا ہے۔ اقوال کے ذکر سے پہلے دو باتیں۔

نوٹ : ہم حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تاویل کے درپے اس لیے نہیں کہ ہمیں ان سے عقیدت ہے حضرت سے ہماری صرف ایک بار ۱۹۹۷ء میں ملاقات ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں اور خاتمہ میں کہا ہے کہ ان کے اکثر اقوال کی تاویلات تو ہمارے ذہن میں دس سالوں سے گردش کررہی تھیں۔ تب ہی تو انشراح صدر سے اس کام پر کمر کس کے آمادہ اس وقت ہوئے ہیں، جب کہ پورے صوبۂ گجرات میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے '' حق پر '' ہونے کی بات کو جہالت سمجھا جاتا تھا بلکہ کام ختم ہونے تک تو کسی کتاب وتحریر کا علم نہیں تھا پھر بھی '' توکلاً علی اللہ '' کام شروع کردیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اقوال واقع میں تاویل صحیح کے متحمل ومستحق ہیں۔ جس سے ہم چاہتے ہیں کہ کسی طرح لوگ ناسمجھی سے نکل جائیں اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ دونوں مشرب '' دارالعلوم اور مرکز نظام الدین '' ہم سفر ہو کر چلیں۔ دوسری بات ہم مشائخ تصوف کے اقوال اس لیے نہیں پیش کررہے ہیں کہ ہمیں تصوف سے ناراضگی ہے۔ بندہ بھی پیر رکھتا ہے لیکن دعوت کی عمومی محنت کی وجہ سے اس سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے۔

اقوال

ہم ان اقوال کو اوپر سے نیچے کی ترتیب پر بیان کرتے ہیں۔ پہلے صحابہؓ کے، پھر مشائخ تصوف کے پھر دور حاضر کے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' قَامَ اَبُوْبَکْرٍ فِی الرِّدَّۃِ مَقَامَ الْاَنْبِیَاءِ '' کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ مرتدین (کے قتال) میں مقام انبیاء پر قائم ہیں۔ہم واقعہ بیان کر کے طول دینا نہیں چاہتے۔ وصال نبوت کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے تن تنہا جو کارنامہ انجام دیا جس میں تمام صحابہ متفق بہ انکار تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ با صرار۔ اس کارنامے کے اختتام پر جب نتائج سامنے آئے تو حضرت صدیق کو داد دیتے ہوئے حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا'' قَامَ اَبُوْبَکْرٍ فِی الرِّدَّۃِ مَقَامَ الْاَنْبِیَاءِ ''۔

اس کا حوالہ تو ابھی بڑی کتاب کا یاد نہیں پڑھا ہوا یاد رہ گیا ہے۔ لیکن سیرت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں ضرور ہے از امام اہل السنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ۔(سیرت خلفاء راشدین ۴۳)۔

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کے قول پر بڑا اعتراض ہے کہ انہوں نے ایک امتی کو مقام ابنیاء پر کیسے کھڑا کر دیا؟ کیا یہ نبی کی اس کی شان میں تنقیص نہیں ہے بلکہ یہاں تو انبیاء جمع کا صیغہ ہے جو تمام نبیوں کی شان میں تنقیص کو بتاتا ہے۔ کہاں ہیں وہ حضرات جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا اعتراض کرتے ہیں۔اسی طرح صحابی رسول حضرت طفیل دوسی رضی اللہ عنہ اور نوح علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی تنقیص کہتے ہیں۔ یہاں جواب دیں اور مسئلہ صرف فقہ کا نہیں ہے عقیدہ کا ہے اس پر کیا حکم لگ سکتا ہے؟

اگر جواب چاہتے ہیں تو حضرت ابو ہریرۃؓ سے سیکھیں نہیں تو ہماری تاویل قبول کرلیں۔ اور اسی کارنامے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''كَرِهْنَاهُ فِي الِابْتِدَا احمِدْنَا عَلَى الِانْتِهاءِ'' کہ ہم نے اس معاملہ کو ابتداء میں تو ناپسند سمجھا تھا لیکن انتہاء میں ہم نے اچھا سمجھا۔

دیکھیے اس کو کہتے ہیں بصیرت بھی اور نظر انصاف و امانت داری بھی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سادہ ذہنیت سے اقرار کررہے ہیں اور اپنی اول نظر کی خطا کا اقرار کررہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ اول نظر میں وہ نادرست دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی درستی بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے اصول حدیث میں مشکل الحدیث اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔ مثلا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کتابیہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت۔۔۔ اور صلح حدیبیہ۔۔۔ اور ابتداء ہجرت میں کفار مکہ کی دب کر صلح کی شرطوں کو مان لینا وغیرہ۔

بلکہ نفس مدارس بھی اس کی مثال ہے اگر تاریخ مدارس پر نظر ہو۔ بقول علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء چوتھی صدی میں ہوئی۔ چناں چہ اہل نیشاپور نے سب سے پہلے ''مدرسہ بیہقیہ'' کی بنیاد ڈالی، لیکن اس کی طرف امت نے کوئی توجہ نہ کی۔ (کتاب الخطط والاثار ۲/ ۳۶۲) تو دیکھیے نظام مدارس کا ابتدائی ڈھانچہ بھی عدم توجہ کا شکار رہا لیکن چوتھی صدی کے بعد بالتدریج وہ رواج کی حد میں داخل ہوگیا اور مدح وتعریف کا سہرہ اپنے سر باندھ لیا۔ ان امثال سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ ابتداءً ایسی ہو رہا ہے ان شاء اللہ انتہاءً بھی وہی ہوگا۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بلا وسوسہ والی نماز کے بارے میں ارشاد ہے ''اِنَّ

الصَلوٰۃَ الّتِی لَاوَسوَسۃَ فِیۡهَا اِنَّمَاهِیَ صَلوٰۃُ الۡیهودِ وَالنَّصَارٰیٰ'' (مرقات ۱۳۶/۱)۔ سوال یہ ہے کہ کون ایسا ہوگا جس کی نماز میں وسوسہ نہ ہو۔ تو کیا سب کی نمازیں یہود ونصاریٰ کی نمازیں بن جائیں گی؟ (⬅) یہ قول تو خود مزاج شریعت کے خلاف ہے، کیوں کہ شریعت میں تو بلا وسوسہ نماز مطلوب ہے اسی لیے تو سینکڑوں احادیث میں اس کی ترغیب وارد ہے اور باقاعدہ اس کی جدوجہد کی جاتی ہے اور کرائی بھی جاتی ہے، جب کہ حضرت علیؓ تو اس کو یہود ونصاریٰ کی نماز فرمارہے ہیں۔ (➡)

(۳) سید الطائفہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا: '' خُضۡنَا بحراً وَقَفَ الۡاَنۡبِیَاءُ عَلَی سَاحِلِهٖ'' (نبراس ۳۳۶) کہ ہم ''معرفت'' میں اس قدر آگے بڑھ گیے کہ انبیاء علیہم السلام تو اس کے کنارے پر ہی ٹھہر گیے۔ مطلب انبیاء علیہم السلام سے بھی آگے بڑھ گئے کتنا بڑا اعتراض ہے! دیکھیے یہاں بھی مسئلہ عقیدہ کا ہے اور آپ معترض کے خیال میں ایک نبی نہیں تمام انبیاء علیہم السلام کی شان میں زبردست تنقیص ہے۔ لحاف اوڑھ کر بیٹھ جائیں گے یا ان اصحاب اقوال سے کچھ سیکھنا بھی سیکھیں گے۔

(۴) سید الطائفہ ہی کا ملفوظ ہے '' اُوتِیَ الاَنۡبِیاءُ اِسۡمَ النُّبُوَّۃِ وَاُوتِیۡنَا اللَّقَبَ اَیۡ حُجِر عَلَیۡنَا اسۡمُ النَّبِی مَعَ اَنَّ الۡحَقّ .. وَیُسَمّٰی هٰذَا المقامُ مِنۡ اَنۡبِیاءِ الاَوۡلِیَاءِ (نبراس شرح عقائد ۴۴۵ حاشیہ مولوی برخوردار) دیکھیے وہ اپنے لیے انبیاء اولیاء کے لقب کے قائل ہیں اور اس کے کہ ہمیں صرف نبوت کے نام سے روکا گیا ہے کہ ہم پر نبی کا اطلاق تو نہیں ہوسکتا لیکن لقب تو پھر بھی ہمیں مل ہی گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنا بڑا اعتراض ہے !! وہ مطلق رفع نبوت کے قائل نہیں۔ وہ تشریعی نبوت کے مرتفع ہونے کے قائل ہیں۔ شاید آپ گھبرارہے ہوں گے کہ یہ کیا لکھا جارہا ہے، لیکن آپ اگر نظر

انصاف، امانت داری اور بہ طورِ خاص تیقظ کو لے کر ہمارے ساتھ رہیں گے تو ان شاء اللہ منزل دور نہیں۔ بس آپ سفر میں نظرِ انصاف اور تیقظ کا توشہ ضرور ساتھ لیں۔

(۵) حسین ابن منصور حلاّج ؒ کا ملفوظ ہے'' اَنَا الْحَقُّ '' یہ تو کتنا بڑا ملفوظ ہے!!! فرعون نے کہا تھا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ تو منصور حلاج کا ملفوظ بھی اس سے کم نہیں ہے۔ نعوذ باللہ۔ یہ تو خدائی دعویٰ ہے۔ کیا جواب دیں گے؟ جب اتنے بھیانک وسنگین اقوال کی تاویل ہوئی ہے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال تو ان کے مقابل میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اس کی تاویل میں ہتھیار ڈال دیں گے لیکن ان شاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایسے اقوال سالوں پہلے کتابوں میں دیکھ چکے تھے اور اس کے درست ہونے کو خدائی عطا کردہ علمی فہم سے پہلے ہی پاچکے تھے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال سے کیسے بھڑکتے۔'' لَوْ کَشَفَ الغِطاءُ ماازِ ددتُّ یقِیْنًا''

(۶) اہلِ تصوف کے بارے میں ہے '' یُنْکِرُ اهلُ التَّصَوُّفِ تَرْکَ الاَوْرادِ کَمَا یُنْکِرُوْنَ الفَرائِضَ '' (مرقات ۳/ ۱۵۳)۔ یہاں تک فرمایا'' تارِکُ الاَورادِ مَلعونٌ ۔ (مرقات ۳/ ۱۵۰)اوراد جو نوافل کا درجہ رکھتے ہیں اسے چھوڑنے کو اہلِ تصوف اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا فرائض چھوڑنے کو بلکہ چھوڑنے والے کو ملعون کہتے ہیں۔ نوافل کو فرائض کا درجہ دیا جارہا ہے کیا یہ معمولی اعتراض ہے؟ اور ترکِ نوافل پر لعنت کیسے؟ حالاں کہ علماء رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ مندوب پر اصرار کرنا تو شیطان کا حصہ یعنی شیطانی عمل ہے کیا اعتراض کی چیز نہیں!!۔ (تعلیق الصبیح ۱/ ۴۰۹ مرقات عن طیبی ۲/ ۳۵۳)۔ اب تک تو ہم نے دورِ صحابہ اور مشائخ تصوف کی مثالیں دیں لیکن ان سب سے آگے چل کر مطمئن ہوجایئے آیئے قرآن کریم کی مثال پر یہاں آپ کہیں گے بس بس بات سمجھ آ گئی۔

(۷) قرآن شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرمان ہے وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ ۔۔ فَلَمَّا رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۔۔۔ قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ۔ (پارہ ۷) حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستارے، چاند اور سورج کو رب فرمایا۔ العیاذ باللہ۔ کتنا بڑا اعتراض ہے؟ کہ امتی نہیں بلکہ نبی ایسی بات کہہ رہا ہے جو باعث کفر و شرک ہے۔ لیکن اس کا حل مفسرین نے بصورت تاویل ایک معمولی جملے سے پیش کر دیا ہے۔ مفسرین نے جس جملے سے حل پیش کیا ہے وہ چاہے ایک معمولی جملہ ہے لیکن وہ درحقیقت اصول کی ترجمانی ہے جن اصولوں کو ہم بیان کرنے والے ہیں اور کچھ کو ضمنی طور پر بیان کر کے آئے ہیں۔ وہ ہے مختصر المعانی کے حوالے سے پیش کردہ بات کہ مخاطب کے حال کو اس کی ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر کلام کرنا یا کہیے دینی مصلحت کو ملحوظ رکھنا وغیرہ۔ یہی وہ باتیں ہیں جو ہم مولانا محمد سعد صاحب کے بارے میں کہنے والے ہیں

(۸) موجودہ زمانہ کی مثال: ہمیں بتائیے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں پوری مسلم قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے کوئی مسلمان یا عالم دین اتحادی کانفرنس میں سری رام، بھگوان وغیرہ کے جملے مجبوری میں زبان سے ادا کرے اور غیروں کے کارنامے کو سراہے باوجودیکہ وہ اسلام سے ٹکراتے بھی ہوں جیسا کہ جمعیت کے پلیٹ فارم سے ہو رہا ہے۔ یا قومی تعصب کو مٹانے کے لیے اور مسلم قوم کو بڑی خرابیوں سے بچانے کے لیے پارلیمنٹ میں کوئی مسلم یا عالم اسی طرح کے اقوال وافعال اختیار کرے ان کے ساتھ نشست وبرخواست رکھے باوجودیکہ وہ افعال ہماری شریعت سے ٹکراتے ہوں۔

تو کیا ان سب کو دارالافتاء لیجا کر کفر کے فتویٰ کا انتظار کریں گے۔ نعوذ باللہ۔ یا دار الافتاء سے بچا کر مسلمانوں کی نمائندگی کا راستہ کھلا چھوڑیں گے، یہ کہہ کر کہ مصلحت کا تقاضہ ہے۔

ظاہری بات ہے کہ لوگ جمعیت و پارلمینٹ کے ان کرداروں کو اپنی ملکی قومی مصلحت سمجھ کر نہ صرف اس کو درست سمجھتے ہیں بلکہ ان علماء حضرات کو داد دیتے ہیں ان کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور ان کے اقوال و افعال کی تاویل کر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تاویل کے بغیر کوئی چھٹکارہ نہیں۔ اگر تاویل کا دروازہ بند کر دیں گے تو تکفیر کا دروازہ کھل جائے گا۔ کیوں کہ جب کوئی قول و فعل بظاہر خلاف شرع ہو تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ خلاف شرع ہونے کا تقاضہ، دینی تقاضہ اور دینی مصلحت تو نہیں، اگر دینی مصلحت ہے تو پھر اس کی گنجائش ہوگی اور اس کی صحت کی تاویل کریں گے جیسے کہ خود اس آیت شریفہ سے مفہوم ہو رہا ہے ''اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ ۔۔۔(پ ۱۴)(←) اور جیسے روایت بالمعنی شرعی مصلحت کی وجہ سے اپنی شروط کے ساتھ جائز ہے'' وَلَا يَجوزُ تَعَمُّدُ تَغْيِيْرُ المتنِ بِالنقْصِ والمرادِفِ اِلَّا لِعَالِمٍ ''(اصول حدیث نزھۃ النظر ۷۱)(→)

(۹) امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مَنْ شَغَلَكَ عِنِ اللّٰهِ فَهُوَ صَنَمُكَ'' (تذکرہ ابوالکلام آزاد ۳۲۲)۔ کون شخص ایسا ہوگا جس کا ماسوا اللہ کے ساتھ اشتغال نہ ہو۔ تو پھر وہ مشغلہ اس کا صنم ہو جائے گا۔ کتنا بڑا اعتراض ہے!! کون بچ سکتا ہے! ہر شخص پر منطبق ہو سکتا ہے اور ہر شخص اس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں ہم صرف بڑے علماء حضرات کے لیے اشارۃً لکھتے ہیں مثلاً: (۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا سورۂ فاتحہ و معوذتین کے بارے میں نظریہ (۲) شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فرعون کی توبہ کے بارے میں نظریہ (نبراس) (۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتابی عورتوں سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو نکاح کرنے سے ممانعت، (ازالۃ الخفاء مترجم ۴۱۰) باوجودیکہ اس کی حلت کتاب اللہ سے ہے، (۴) اسود عنسی مدعی نبوت کذاب

نے ''عبداللہ بن ثوب رحمہ اللہ تعالیٰ'' کو نبی نہ ماننے پر آگ میں ڈالا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا ''حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شبیہ اس امت میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ (سیرت خلفاء راشدین ۱۱۰) (۵) حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس نے نماز میں خشوع اختیار نہیں کیا اس کی نماز فاسد ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کوئی بھی نماز جس میں حضور قلب حاصل نہ ہو اس کی نماز سزا دینے کے زیادہ لائق ہے۔ (تعلیق الصبیح ۱/۲۶۶) پوچھیے دارالافتاء کے علماء حضرات سے کہ فقہ میں کتنا خشوع فرض ہے؟ فقہ میں صرف بوقت تکبیر تحریمہ خشوع فرض ہے، پھر حضرت سفیان وحسن پر کیا فتویٰ لگائیں گے۔ جب کہ علم باطن کے یہاں پوری نماز میں ضروری ہے ان علم باطن والوں سے کیسے نمٹیں گے۔ حضرت علیؓ کا قول اس سے بھی زیادہ سنگین گزرا ہے وہ بھی ملحوظ رہے۔

(←)(۶) آیت شریف ''لَو کَانَ فِیهِمَا اٰلِهَةٌ إلا اللہُ لَفَسَدَتَا'' کو تعدد الٰہ کی نفی پر برھان قطعی نہ ماننے بلکہ حجت اقناعیہ ماننے پر علامہ سعد الدین تفتازانی پر ان کے معاصر ''شیخ عبداللطیف کرمانی'' کی جانب سے اعتراض کرنا بلکہ کفر قرار دینا، باوجودیکہ اس کا جواب تفتازانی کے شاگرد ''شیخ علاؤالدین بخاری'' نے دیا ہے۔ (الجواہر البہیہ عربی شرح، شرح عقائد ۲۶۳/۱، وجواہر الفرائد ۱۸۱)۔(→) (۷) شیخ ابوسعید خرازؒ فرماتے ہیں ''فَتَحَ اللہُ عَلَیْهِ بَابَ الْقُرْبِ ثُمَّ رَفَعَهُ إِلٰی مَجَالِسِ الأُنْسِ ثُمَّ أَجْلَسَهُ عَلٰی کُرْسِیِّ التَّوْحِیْد'' (مرقات ۱/۲۷۱) دیکھیے تو صحیح اہل اللہ نے کیا کیا کہا ہے اور علماء حضرات نے کیا کیا لکھا ہے!! لیکن پھر بھی ضلالت کا حکم نہیں لگا۔ کیا اب آپ بنظر انصاف بتائیں گے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر وہ حکم لگ سکتا ہے کہ نہیں؟

نوٹ : ہم کسی اور سے نہیں معترض کو کہہ رہے ہیں کہ کیا ان سب میں تاویل کریں گے اگر نہیں تو پھر ان سب پر کیا حکم لگائیں گے؟ اور اگر سنگین حکم سے بچانے کے لیے تاویل کریں گے تو پھر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی کیوں نہیں؟ جب کہ دونوں اقوال کی سنگینی یکسا ہے۔ آپ خود تاویل کیجیے نہیں تو ان شاء اللہ ہم ان کی تاویل پیش کریں گے۔

طلب فتویٰ اور دارالعلوم کا فتویٰ

ہم اس کا اذعان کرتے ہیں کہ اللہ نے اگر علم کی دولت عطا کی ہو تو وہ خواہ مخواہ کسی سے ٹکراؤ کے لیے نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کے لیے، اس کی نشر و اشاعت کے لیے اور اظہار حق کے لئے ہے۔ سمجھیے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ضروری باتیں بتائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توجہ حاصل ہوئی تو فرمایا ''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عمر کے پاس علم نہیں تھا اس طرح ہماری جانب سے ضروری بات بتانے کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات علماء دیوبند۔ دامت برکاتہم کے پاس علم نہیں۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دارالعلوم ہمارا ایسا علمی مرکز علمی قلعہ ہے جیسا نظام الدین ہمارا دعوتی مرکز ہے۔ ہمیں اپنے دارالعلوم پر بجا طور پر ناز ہے۔ لیکن کچھ ضروری گزارشات بھی ہیں جنہیں ادب سے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور تعظیم و ادب میں کوئی ذرہ برابر مبالغہ نہیں دل کی کیفیت کو خدا جانتے ہیں یہ تو '' اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ '' کی وجہ سے ان کا ہم پر لازمی حق ہے ایسا ہی جیسا اپنی سمجھ پیش کرنا ہمارا شرعی لازمی حق ہے۔ ''فَاِنْ اَصَبْتُ فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ اَخْطَأْتُ فَمِنِّی وَمِنَ الشَّیْطَانِ'' وہ یہ کہ

زیادہ تر مسئلہ میں معترض کو جو قوت حاصل ہوئی ہے اور اکثر لوگوں کی حضرت مولانا محمد

سعد صاحب سے جو بدظنی پیدا ہوئی ہے وہ ہے دارالعلوم کا فتویٰ۔ ورنہ لوگ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ ہم فتویٰ کے کسی طرح نہ مخالف ہیں نہ اس کے منکر، ہم خود اگر اس مسند پر ہوتے تو غالباً وہی لکھتے جو دارالافتاء نے لکھا ہے۔ کیوں کہ فتوی کا مدار استفتاء پر ہے ''جیسی روح ویسا فرشتہ'' مستفتی نے جو کام کیا ہے وہ غلط ہے۔ دارالافتاء نے جو کیا وہ غلط نہیں۔ غالباً اب تو علماء حضرات کو بھی یہ بات درست محسوس ہو رہی ہوگی۔ غلط اقدام کی ہم دو وجہ تحریر کرتے ہیں۔

طلب فتوی غلط اقدام تھا

وجہ اول : اگر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال واقعتاً قابل اعتراض تھے جیسا کہ دارالعلوم کا موقف ہے اور معترض کا خیال ہے تو خود قائل سے اولاً معنی معلوم کیا جاتا یا دیگر علماء حضرات سے معلوم کیا جاتا اور سب مل کر اس کی کوئی صحیح تاویل کرتے جیسے شریعت و دین کی تعلیم ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲۸، ۲۹ پر تو معاملہ اور مسئلہ اس قدر زور نہ پکڑتا۔ بلکہ جنہیں حضرت مولانا کے اقوال پر اعتراضات تھے وہ خود ان ہی حضرات علماء دیوبند سے روبرو جا کر اس کی درخواست کرتے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں وہ ہمیں دین و شریعت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھا دیجئے یا ان کی کچھ تاویل کر کے بتائیے جس سے ذہن قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

اور اگر روبرو نہ بھی جاتے بلکہ اسی دارالافتاء میں تحریراً خط ارسال کرتے اور مطالبہ بس اسی کا کرتے جو اوپر ذکر ہوا اور اس میں ایک جملہ یہ بڑھا دیتے کہ ہمیں اس کا حکم یا فتویٰ مطلوب نہیں ہے ہمیں تو صرف درست معنی و تاویل درکار ہے تو یقیناً دارالعلوم وہ فتویٰ نہ دیتا جو دیا گیا نتیجۃً یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ ثابت ہوا کہ خیانت کا ارتکاب ہوا ہے۔ دراصل لوگ غلط کام کر کے

دارالافتاء کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں ''بلی کا بکرا'' بناتے ہیں جیسا کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی ہے فرمایا ''یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّجْعَلُوْا ظُهُوْرَنَا جَسْرًا اَلَّهُمَّ اِلٰی جَهَنَّمَ'' ہم نے اس کو اور جگہ بھی لکھا ہے۔

وجہ ثانی : جب قائل کا کوئی قول وفعل بین خلاف شرع ہو۔ جیسا کہ رجال دین کے تمام اقوال اور مولانا محمد سعد صاحب کا قول ''ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی'' تو بالکل ظاہری بات ہے آنکھ بند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا صحیح ہونا قرآن وحدیث سے کسی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ وہ ایسا بین خلاف شرع ہے جس کا غلط ہونا نہ صرف علماء حضرات سمجھ سکتے ہیں بلکہ عوام کالانعام بھی سمجھ سکتے ہیں، اس کو مزید آسان مثال میں یوں سمجھیے فرض کیجیے گویا حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ''بلاوضو نماز جائز ہے'' اب اس کو تو مکتب پڑھا ہوا ہر بچہ بھی سمجھ لے گا کہ یہ غلط ہے۔ تو اب

ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی

عرض یہ ہے کہ ایسے واضح مسئلہ کو دارالافتاء لیجانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جب حکم معلوم ہے کہ بلاوضو نماز جائز نہیں اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ دارالافتاء میں کوئی نامعلوم معاملہ حکم معلوم کرنے کی غرض سے لے جایا جاتا ہے اور یہاں تو پہلے سے معلوم ہے۔ معلوم ہوا حکم معلوم کرنا غرض نہیں تھی بلکہ فاسد غرض تھی۔ اور اگر معترض وغیرہ یہ کہے کہ نہیں دارالافتاء لیجانے کی ضرورت تھی چاہے حکم معلوم تھا اور وہ ضرورت ہے، یہ معلوم کرنا کہ ایسے قائل کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ پس اگر یہ غرض تھی تو خیانت اور فاسد غرض واضح ہو چکی کیوں کہ آپ اس تاویل کو نہیں چاہتے جس تاویل کی ضرورت ہم نے پہلے جتائی ہے۔

پھر بھی ہم اس ضرورت کا بھی انکار ثابت کیے دیتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ دار

الافتاء لیجانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی پھر واضح ہوجائے گا کہ ہمارا دعویٰ ''طلب فتویٰ غلط اقدام تھا'' اور ''ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی'' صحیح ہے اور طالب کی خیانت بھی واضح ہوجائے ۔وہ ضرورت کا انکار یہ کہ ہر ذی شعور شخص اتنی بات تو ضرور سمجھتا ہے کہ جو بات بین خلاف شرع ہو مثلا ''بلا وضو نماز جائز ہے'' ایسی بین خلاف شرع بات بچہ بھی نہیں کہہ سکتا، اسے نیند سے اٹھا کر پوچھیں تب بھی ایک ہی رٹ لگائے گا کہ نماز جائز نہیں تو یہاں غور کی بات یہ ہے کہ جو بات ایک کم سن بچہ نہیں کہہ سکتا آخر اتنا بڑا آدمی ''حضرت مولانا محمد سعد صاحب'' کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا مولانا کو اتنا چھوٹا مسئلہ بھی معلوم نہیں؟ یا معلوم ہے لیکن انہیں اپنی عزت کا ذرا خیال نہیں یعنی بالکل ناسمجھ ہیں کہ ان پر گمراہی کا حکم لگ سکتا ہے، چلیے اُس وقت اپنے درجہ اور مرتبہ کا لحاظ یاد نہیں رہا، اب تو اپنی مخالفت کے ڈر سے مان لیتے ۔لیکن ابھی بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس قول کی کوئی خاص وجہ ہے ضرور اس میں کوئی راز مخفی ہے۔

ایسی صورت حال میں قول (اقوال) اہم نہیں ہوتا کیوں کہ قول تو بچہ بھی جانتا ہے بلکہ وجہ قول اہم ہوتی ہے کہ آخر کس وجہ سے وہ ایسا کہہ رہے ہیں؟ جیسا کہ ذکر کردہ ''رجال دین کے اقوال میں'' وہ اقوال اہم نہیں تھے بلکہ ان کی وجوہ اہم تھیں ۔جس جس وجہ سے اور جس پس منظر میں انہوں نے وہ اقوال اختیار کیے وہ باعث تھے ان اقوال کے لیے ۔خلاصہ یہ کہ لوگ اس کو اہمیت دے رہے ہیں کہ مولانا محمد سعد صاحب نے ایسا ایسا کہا، حالانکہ وہ اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا ؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی، ضرورت اس کی تھی کہ وجہ قول اور منشأ قول کو معلوم کیا جاتا۔

اب ظاہری بات ہے کہ کسی نامعلوم قول ''ایسا کہا'' کا جواب تو دارالافتاء کے پاس ہے، لیکن وجہ قول ''ایسا کیوں کہا'' کا جواب کسی بھی دارالافتاء کے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ وجہ

قول تو صرف قائل ہی بتا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دار الافتاء سے قول کا جواب تو مل سکتا ہے لیکن وہ یہاں مطلوب نہیں بلکہ مطلوب وجہ قول ہے لیکن وہ دار الافتاء کے پاس موجود نہیں۔ تو پھر دار الافتاء لیجانا غلط ہوا۔ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ ضرورت وجہ قول معلوم کرنے کی تھی۔ اب یہاں کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ وجہ قول کیوں اہم ہے؟ تو اس کا جواب اس لیے کہ قول کی بنا ''وجہ قول'' پر ہوتی ہے اور ہر قول کا باعث اس کی بنا ہوتا ہے۔

اگرچہ اکثر علماء حضرات کے نزدیک تو اقوال اہم ہوتے ہیں، لیکن ان علماء حضرات سے پوچھیے جن کی نظر اصول شریعت پر ہے، اصولین کے یہاں اقوال سے زیادہ وجوہ اقوال اہم ہوتے ہیں۔ اور ہر قائل وفاعل کے پاس وجہ قول وفعل ضرور ہوتی ہے ''لِكُلِّ قَائِلٍ جِهَةٌ'' جس پر وہ عمل پیراں ہوتا ہے۔ جب وجہ قول ہو پھر وہ عمل کیوں اختیار نہ کرے۔ ''كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهٖ، كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ، وَكُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔۔''

وجہ قول معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ

یہاں مستفتی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے طلب فتویٰ کے اقدام کو غلط بتایا اور وجہ قول معلوم کرنے کی ضرورت سمجھائی تو ٹھیک ہے لیکن حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے وجہ قول کیسے معلوم کریں جب کہ وہ کسی سے ملتے ہیں نہیں اور بیانات میں بھی وجہ قول بتاتے ہیں نہیں؟ تو ہم ایک اور طریقہ بتاتے ہیں لیکن پہلے یہ بھی معذرت کرلیں کہ وہ نہیں ملتے تو آپ ان سے بدظن نہ ہوں، جب وہ اتنا بڑا کام لے کر بیٹھے ہیں ہر کسی سے ملتے رہیں تو کام کیسے ہوگا؟ دنیا میں ہر چھوٹا بڑا شخص اپنی ذمہ داری میں مصروف ہوتا ہے جس میں ملنا قانون کے خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے۔ خیر اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح وجہ قول، قائل کی زبانی بتانے سے معلوم ہوتی ہے اس طرح اس کی زندگی کے شب وروز کے احوال ومعمولات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

قائل کے اقوال جمیعہ وافعال جمیعہ اس کی زندگی کی شرح مکشوف ومفتوح کتاب ہوتی ہے۔

اصحاب متون کی عبارتوں کا ذوق جب شراح سمجھ لیتے ہیں تو مغلق مقامات پر ماتن کی ترجمانی اس کی کتاب کے کلمات واقوال کا سہارا لے کر ہی کرلیا کرتے ہیں کہ ماتن کی مراد اس سے کیا ہے۔لہٰذا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے زندگی کے بین گوشے آپ کی یہ طلب وآس بھی پوری کریں گے اگر آپ صحیح راہ پر ہیں۔مطلب متکلم وقائل کے عقائد، اس کے فرائض اسلامیہ کی ادائیگی، اس کی سنن وآداب کی رعایت اس کے شب وروز کے معمولات اس کی فکر وسوچ اس کے غیر متعین کلام کی مراد کے تعین میں معین ومددگار ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا جس ''اصلاح وتربیت'' کے مسند پر ہیں اس مسند کو سامنے رکھ کر ان کے اقوال کی تشریح کی جائے جس طرح اہل تصوف کی مسند وغیرہ کو ملحوظ رکھ کر ان کے اقوال کی توجیہ کی جاتی ہے تو ان کے اقوال کی صحیح مراد فوراً سمجھ آجائے گی۔

افسوس دارالافتاء سے نہ ہوسکا !

سابقہ مضامین ولاحقہ مباحث کے پیش نظر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن صرف اظہار حق کے طور پر نہ کہ اپنے بڑوں سے ٹکراؤ میں کہ جن استفتاءات کا تذکرہ درالعلوم دیوبند کے دار الافتاء نے کیا ہے جس کے ردعمل میں جو تاریخی فتویٰ جاری کیا اس سے قبل یہی کام کرنا چاہیے تھا کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تشریح وتاویل ان کی زندگی کی مفتوح کتاب سے کی جاتی اور سائل کو مطمئن واپس کیا جاتا جس سے سارا مسئلہ وفتنہ ہی دب جاتا لیکن افسوس یہ نہ ہوسکا سب سے بڑی بات سمجھنے کی یہی ہے۔(←) چناں چہ امام غزالیؒ بھی یہی بات لکھتے ہیں'' مفتی فتویٰ دینے میں جلدی نہ کرے بلکہ جب تک اسے بچ رہنا ممکن ہو بچ رہے۔اگر کوئی شخص ایسا مسئلہ دریافت کرے جس میں تردد وشک ہو تو اپنی لاعلمی کا اعتراف کرلے اور اگر مسئلہ کی

صحت کا ظن غالب ہو تب بھی اس کے بتلانے میں احتیاط رکھے۔ صحابہ کرامؓ چار چیزوں کو ایک دوسرے پر ڈالتے تھے ایک امامت، دوسری وصیت، تیسری امانت، چوتھی فتوی۔ بعض اکابر فرماتے ہیں کہ عالم دو ہیں۔ ایک عوام کا عالم، یہ شخص مفتی کہلاتا ہے ایک خواص کا عالم یہ توحید اور قلب کے اعمال کا علم رکھتا ہے ایسے لوگ تنہا اور متفرق رہتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۷۵ تا ۷۶ علماء آخرت کی چھٹی علامت)۔ (➡)

ہاں دارالافتاء سے نہ ہوسکنا یہ کوئی خرابی کی بات نہیں کیوں کہ جب ایک امام مجتہد سے خطا ممکن ہے تو مقلد کی کیا حیثیت، لیکن ہاں اس میں فتنہ سے بچاؤ تھا جس فتنہ سے بچاؤ کے لیے بہت سی ایسی شرعی توسعات کھل جاتی ہیں جو پہلے ممنوعات کی بندھن میں بند ہوتی ہیں۔ نیز یہ چیز مسئلہ کے تفقد سے متعلق بھی نہیں بلکہ خارج از مسئلہ ہے۔ ضرورت صرف پیش آمدہ مسئلہ میں تیقظ کی تھی جس کے فوت ہونے پر مسئلہ اٹھا۔ یہ ہے ہمارا خیال۔ (واللہ اعلم)

مذکورہ بات ضروری اس لیے تھی کہ مفتیان کرام پر بھاری ذمے داری ہے، وہ کوئی معمولی منصب نہیں ہے کہ اس میں کوتاہی برتی جائے ورنہ عمل کا گناہ ان پر عائد ہوگا۔ اسی بھاری ذمہ داری کو ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف وڈر کے اسلوب میں یوں بیان کیا ہے ''وَمِنْ ثَمَّ اِشْتَدَّ خوفُ السَلَفِ مِنَ الِافْتَاءِ فَكَثُرَا مْتِنَاعُهُمْ مِنْه'' (مرقات ۱/ ۳۱۴ باب العلم) یعنی اسلاف رحمہ اللہ تعالیٰ انہی بھاری ذمہ داریوں کی وجہ سے بذات خود بھی مسند افتاء پر بیٹھنے سے بچتے تھے بلکہ دیگر لوگوں کو بھی بکثرت روکا کرتے تھے۔ اور امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مہذب میں فرماتے ہیں ''اِعْلَمْ اَنَّ الْافتاءَ عَظِيْمُ الخطرِ. قَدِيْرُ الْمَوْقِعِ. كَثِيْرُ الْفَضْلِ''۔ (اصول الافتاء ۱۲ عن امام النووی)

جب مفتی کوئی ایسا استفتاء پائے جس کے جواب پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو کئی طرح کی حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے، تاکہ فتنہ وشر سے حفاظت ہو جائے مثلاً صریح جواب کو چھوڑ کر مجمل

جواب پر اکتفاء کرنا۔۔۔ بلکہ علماء اسلام نے عام اہل علم اہل فتویٰ کو جو خصوصی ہدایات دیں ہیں اس کے پیش نظر مخاطب کا۔ چاہے خطاباً ہو کہ تحریراً ہو۔ جواب یا فتویٰ مؤخر کر کے چھٹکارہ پالے۔ ۔۔۔ یا بالکل ہی فتوی موقوف کر دے تا آنکہ جواب مفید ثابت ہو یا کم از کم دفع شر کا یقین حاصل ہو۔۔۔ اور ضرورت پڑنے پر جواب کو مؤخر کر کے اس کی ذہن سازی بھی کرسکتا ہے بلکہ کرنا چاہیے۔ اس کی ضرورت شریعت نے اس لیے جتائی کہ بعض سائل یا بعض مستفتی حق جاننے اور اس پر عمل کے لیے مسئلہ نہیں لاتے بلکہ فتنہ کھڑا کرنے کے لیے لاتے ہیں اور وہ اس کا بوجھ عالم یا مفتی پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہم نے بتایا ہے یا بعض ایسی غلط نیت تو نہیں رکھتے ان کا ارادہ تو صالح ہوتا ہے لیکن وہ کم سمجھ ہوتے ہیں پھر پوچھے مسئلہ سے جواب پر کوئی اور شخص فتنہ اٹھا کر اسے ہوا دینے لگتا ہے بالآخر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے جیسا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں ہوا۔

صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی ہدایت کو بیان کیا ہے۔۔۔ ’’وَهٰذِهٖ طَرِيْقَةٌ عَلَى كُلِّ ذِىْ عقلٍ اَن يَّسلكَها مَعَ الجَهَلَةِ وَالْفَسَقَةِ اِذَا اِسْتَفتَاهُ وَاحِدٌ مِنْهُمْ اَن يُقَدِّمَ اِلا رشادَ وَالنَّصِيْحَةَ اَوَّلًا وَيَدْعُوْهُ اِلى مَاهُوَ اَولى بِهٖ وَاَوْجَبَه عَلَيْهِ مِمَّا اِسْتَفْتٰى فِيْهِ ثُمَّ يُفْتِيْه‘‘ (روح المعانی ۱۲/ ۵۸۸) یہاں زیادہ غور کی بات یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہم السلام نے تو توحید کی دعوت کے لیے جواب مؤخر کیا تھا جب کہ مسئلہ مذکورہ میں مسلمانوں کو یعنی اہل توحید کو دین پر جمانے یعنی فتنہ سے بچانے کے لیے یہ کام کرنا تھا جو پہلے کے مقابلے میں اہم ہے۔ کیوں کہ کسی مسلمان کو اسلام پر جمانا بنسبت غیر مسلم کو اسلام پر لانے سے مقدم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں تو دار العلوم کا فتویٰ بھی قابل اعتبار نہیں رہتا باوجودیکہ جواباً وہ درست ہے خلاصہ یہ کہ مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تاویل ہی کا راستہ، صحیح راستہ تھا۔

(⬅) مذکورہ بالا بات کو شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے بڑے دلنشین انداز میں لکھا ہے۔ لکھا ہے کہ فقیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ متبادل راستہ نکالے۔ فقیہ کی صرف اتنی ہی ذمے داری نہیں ہے کہ یہ کہہ دے کہ فلاں چیز حرام ہے بلکہ اس کا متبادل راستہ بھی بتادے کہ یہ حرام ہے اور تمہارے لیے حلال راستہ یہ ہے۔ کیوں کہ فقیہ صرف فقیہ نہیں ہوتا بلکہ وہ داعی بھی ہوتا ہے۔ اور داعی کا کام محض خشک قانونی کام نہیں ہوتا کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے بلکہ داعی کا کام یہ بھی ہے۔۔۔۔ (اصلاحی خطبات ۲۷۵/۷) اور بقول ملاعلی قاریؒ توقف کرے وہ فرماتے ہیں کہ مفتی مشتبہ امور وعلوم میں توقف کرے'' وَفيهِ اشارةٌ إلى التوقُّفِ فِيمَا أشكلَ مِن الامورِ وَالعلُومِ ''۔ (مرقات ۲۳۱/۱) چناں چہ حضرت طاہر بن حسینؒ نے اپنے صاحب زادہ عبداللہ بن طاہر کو ان کے گورنر ہونے وقت انفرادی واجتماعی امور سے متعلق اصلاحی آب زر سے لکھنے کے قابل جو جامع عمدہ وصیتیں فرمائی ہیں اس میں ہے کہ آدمی بسا اوقات کسی معاملہ میں جب غور وفکر کرتا ہے تو اس میں اس کی خواہشات کا دخل ہوجاتا ہے اور فیصلہ خلاف حق ہوجاتا ہے '' فَانه رُبما نظر الرجلُ فى أمرِه وقد أتاهُ على مَايهوَى فَاغواهُ ذٰلِكَ ''۔ اور توجہ دلانے کے لیے کہا ہے ''ثم فرِّغ لِمَا يُورَدُ عَلَيكَ مِنْ ذٰلِكَ سَمعَكَ وَبَصرَكَ وفَهمكَ وَعَقلَكَ و كرِّر النظر فيه والتدبّر لَه فما كَانَ مُوافِقًا للحقِّ والحزمِ فَامْضِه۔۔۔'' (القراءة الرشيدہ ۶۶/۴) (➡)

عدم سبقت ذہن اور تاویلات سے غفلت

ہم حضرات علمائے دیوبند دامت برکاتہم سے اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں اور نظر انصاف قائم رکھتے ہیں کہ ہم یہ کہنے پر کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ جب ہم حضرات علماء دار العلوم

کوحضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے مقابل کھڑا کریں اور فیصلہ لیں تو یقیناً حضرات علماء دیوبند قابل ترجیح ہیں کیوں کہ نسبتِ علم ان ہی کی طرف واضح ہے جب کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف غیرواضح۔لیکن دین وشریعت پراوراشخاص دین وشریعت پر وسیع نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے، کہ دینی مختلف شعبوں کے حاملین میں بھی کچھ دوری بنی رہتی ہے چاہے یہ بات دور حاضر کی ہو کہ دور ماضی کی چناں چہ دور ماضی کے بارے میں حضرت ملاعلی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اَلِاخْتِلَافُ بَیْنَ الْمُتَصوِّفَةِ وَاَصْحَابِ الْعُلُوْمِ الظَّاهِرَةِ ـ ـ ـ'' (شرح نزھۃ النظر ۱۱۷، ۱۱۸) (⬅) بلکہ خودعلوم ظاہرہ کے حاملین میں بھی شدیداختلاف ماضی میں پایا گیا جیسے احناف وشوافع کے درمیان حتی کہ علامہ ابن حجرؒ نے وضع حدیث کے اسباب میں فرط عصبیت کوذکرکیا ہے اورمثال بعض مقلدین سے بیان کی ہے ''اَوْ فرطِ العَصبِيَّةِ كَبَعْضِ المقلدينَ (نزھۃ النظر ۲۲) چناں چہ ملاعلی قاریؒ نے شرح میں دوموضوع حدیث ذکر کی ہے۔ایک : يَكُونُ فِي أُمَّتِيْ رجلٌ يُقالُ لَهٗ محمدٌ بن إدريس يكونُ اَضَرَّ عَلَى أُمتِيْ مِن إبليس'' اوردوسری حدیث ''اَبُوْ حَنِيْفَةَ سَراجُ أُمتِيْ'' (شرح قاریؒ ۱۳۸) (➡)

نیز ویسے بھی دلوں کی خرابی اور نیتوں کی کھوٹ ہرزمانہ میں ہر چھوٹے بڑے سے کم وبیش ظاہر ہوتی ہے حتی کہ ہجرت جیسے بڑے عمل میں بھی جیسا کہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' کا شان ورود ہے سوائے خلافت راشدہ نصف اول کے زمانہ کے لوگوں سے کہ اس زمانہ کی خصوصیات میں ایک تو یہی ہے کہ وہ دلوں کی خرابی سے بالکل دور تھے۔اور دوسری اشاعت اسلام ہے۔

بایں وجہ احتمال پیدا ہوجاتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی صحیح تاویل ''قصداً نہیں'' بلکہ فطری اس دوری کی بنا پر بوجہ عدم سبقت ذہن نہ ہوسکی ہواوراس میں وہی وجوہ کارفرما ہوں جن کا ذکر ایک اورجگہ ہوا ہے یعنی عدم تیقظ ،غلو فی الاحتیاط اور دعوت کی

حقیقت سے نا آشنائی بایں وجوہ دارالعلوم کا فتویٰ قابل غیر ترجیح بن جاتا ہے۔

عدم سبقت ذہن ہی راجح ہے

اگر عدم سبقت کی بات کے رد میں کوئی کہے کہ علمائے دیوبند حضرات کا فتویٰ مستقل علماء حضرات کی ایک جماعت کے ذریعہ مرتب ہوا ہے اس میں عدم سبقت کی گنجائش نہیں ہے جو لکھا وہ بجا ہے لہٰذا مسئلہ کے عدم وضاحت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ تو ہم کہیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ دستخط کنندہ علماء حضرات پر تاویل واضح ہوچکی ہو لیکن زور دفتر اور اس کے وزن کی وجہ سے کرہاً دستخط ہوئی ہو۔ '' كَمَا هُوَ الْمُتَعَارَفُ ''۔ یہ بات بھی صرف احتمال کی فہرست میں آنے کی وجہ سے ہے نہ کہ یقین والزام کے درجہ میں۔ نیز مذکورہ بات کے رد میں ہم یہ بھی کہیں گے کہ مان لیا سب ہی نے دستخط طوعاً ہی کی ہے لیکن پوری جماعت پر مسئلہ کی عدم وضاحت کیبات کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔

کیوں کہ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ تو صرف ایک چھوٹی اور قلیل جماعت کا مسئلہ ہے کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے بلکہ ہوا ہے کہ پوری جماعت پر بھی مسئلہ مشتبہ رہے کیوں کہ پوری جماعت متقدمین پر بھی مسئلہ مشتبہ رہنے کی نظیر ہمارے پاس ہے کہ جو مسئلہ متقدمین پر مشتبہ رہا وہ متاخرین پر واضح ہوا، اور وہ مسئلہ ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان وعدم ایمان کا، چناں چہ صاحب مظاہر حق علامہ قطب الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں ''۔۔۔ یہ بات گویا پہلے زمانہ کے علماء سے چھپی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے بعد کے علماء پر اسے ظاہر کردیا''۔ (مظاہر حق جدید ۲/۸۷۴)۔ جس سے پھر یہ احتمال عود کر کے آجاتا ہے کہ صحیح تاویل میں سبقت ذہن نہ پائے جانے کی خطا ہوئی ہو اور مسئلہ عدم وضاحت کا شکار ہوا ہو۔ یہ سب احتمالات کے درجہ میں ہیں الزام کے درجہ میں ہرگز ہرگز نہیں۔ '' واللہ اعلم بالصواب''

اور ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالی وغیرہ نے جمہور کے خلاف اپنے مدعی پر صحیح روایات بھی نقل کی ہیں اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تین رسائل بھی تصنیف کیے ہیں۔ (مرقات ۴/ ۱۱۳) تو اب اس احتمال کو تسلیم کرنا ممکن ہوگیا۔ یقین ہرگز نہیں۔ کہ حضرات علماء دیوبند پر بھی تاریخی فتوی مشتبہ ہوگیا چاہے مشتبہ ہونے کی ماقبل میں ذکر کردہ وجوہات میں سے جو بھی رہی ہوں۔ مثلاً وجہ قول معلوم نہ کرسکنا۔۔۔فتویٰ میں حکمت عملی کا ترک کرنا۔۔۔علوم ظاہرہ وباطنہ میں دوری کی وجہ سے ذہن کا سبقت نہ کرنا۔۔۔انتہائی تیقظ سے کام نہ لیا جانا۔۔۔اور سب ہی علماء کا واضح شدہ حقیقت پر طوعاً مجتمع نہ ہونا وغیرہ۔

یادرکھیے ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ یہ علماء دیوبند حضرات پر نہ الزام ہے نہ ان کو فتوی میں غلط بتانا ہے بلکہ ان کا فتویٰ بال کے برابر بھی شریعت سے ہٹ کر نہیں ہم اپنے علماء سے حسن ظن بھی رکھتے اور ان کے علم پر اعتماد بھی ''مَا اتَّخَذْنَاهُ وَرَاءَ ظَهْرِيًّا'' لیکن جو لکھا ہے وہ بھی احتمال کی صورتیں ہیں، انہیں زبردستی پیدا نہیں کیا گیا ہے جو ممکن حد تک ہوسکتی ہیں ان کو بیان کیا ہے یہ ایک ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی خاموشی کی وجہ

لوگ اس بارے میں بھی تردد میں ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب خاموش ہیں باوجودیکہ ان کے خلاف طوفان نوح کی طرح طوفان برپا ہے، وہ خود ہی مسئلہ کی وضاحت کیوں نہیں کردیتے جس سے معاملہ ہی صاف بے غبار ہوجائے۔ تو آیئے ہم اس خاموشی کی تین وجوہات پیش کردیتے ہیں۔

پہلی وجہ : درحقیقت حضرت مولانا محمد سعد صاحب اس بابت حضرات علماء دیوبند کے علم

وفن کا ادب ولحاظ کرتے ہیں ان سے علمی لحاظ سے حسن ظن رکھتے ہیں اور گویا یوں سمجھتے ہیں کہ علوم ظاہرہ میں ہم چھوٹوں سے اگر کوئی اونچ نیچ اور کوئی کوتاہی ہوجائے تو یہ بڑے حضرات اسے نپٹ لیں گے ہمیشہ بڑے چھوٹوں کا اس طرح خیال رکھ لیا کرتے ہیں وہ چھوٹوں کو تنگ نہیں کرتے، ان کو اس کا حسن ظن ہے کہ ان کا علمی دامن نہ صرف وسیع ہے بلکہ عمیق بھی ہے، انہیں حضرات علمائے دیوبند کے وسیع وعریض علم وبصیرت پر اعتماد ہے اور نہ صرف انہیں بلکہ ہمیں بھی ہونا چاہیے۔ جب یہ بات ہے تو اب زبان کھولنا ادب واعتماد کے خلاف ہوگا۔

اس حسن ظن واعتماد کا تقاضہ تھا کہ حضرات علمائے دیوبند آتے اور پردہ اٹھاتے اور اعتماد کو پاش پاش ہونے سے بچالیتے اور لوگوں کے سامنے عیاں کرتے کہ تم ایسے شخص کے بارے میں کس ذہنیت سے یہ اعتراضات اٹھاتے ہو جس کی زندگی ایک ایسی مکشوف کتاب ہے جس کا ہر ورق ہر سطر پوری دنیا پڑھ رہی ہے، وہ اور اس کی زندگی کوئی منتظر مہدی کی طرح ''سُرَّ مَنْ رَای'' شہر کے سرادب میں مختفی تو نہیں۔ اس طرح وہ معاونت سے کام کو آگے بڑھاتے لیکن ''لَیتَ الشبابَ یَعودُ''۔

دوسری وجہ : ہر میدان اور ہر مشن کا ایک دستور ہے کہ وہ اپنی دُھن اور تن من دھن سے منزل کی طرف آگے بڑھنے میں مصروف رہتے ہیں، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ہماری نجی حالتوں سے کس کو کتنی اور کیوں نارضگی ہے، وہ ان سوالات کی طرف مطلق لیکن قصداً بر سبیل حکمت التفات نہیں کرتے تاکہ منزل کی طرف پیش قدمی اور ترقی میں کوئی کمی اور خلل واقع نہ ہو یہ عام مشن کا دستور ہے سوائے ''علم مناظرہ'' کے۔

تیسری وجہ : اس طرز عمل کو یعنی کنارہ کشی، خاموشی اور یکسوئی سے کام میں انہماک کو عام تہذیبی کتابوں میں اعلی تہذیب اور خصوصاً کتب دینیہ وکتب اسلامیہ میں ''مقبول بندوں'' کی علامات

میں شمار کیا گیا ہے دیکھیے حوالہ میں (معارف القرآن ۶ / ۵۰۲، ۵۰۹) ۔ پھر اس سعادت کو کیسے گنوایا جا سکتا ہے!

(⬅) یہ حلم اور تحمل مزاجی جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب میں ہے وہ کتنی بڑی صفت ہے وہ سمجھیے ۔ اللہ تعالیٰ تو حلیم ہے ہی اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے ''اِنَّہٗ حلیمٌ اَوَّاہٌ منیبٌ'' کہ ابراہیم بھی حلیم الطبع ہیں ۔ اور جب حضرت ابراہیمؑ نے اولاد طلب کی تو صالح اولاد طلب کی ''رَبِّ هَبۡ لِيۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ'' سوال ہے صالح کا اور جواب ہے حلیم کا معلوم ہوا جو حلیم ہے وہ صالح ہے، حلیم نہ ہو وہ صالح بھی نہیں ہے ۔ یہ صفت ہو پھر کیسے الجھتے ۔ حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب نے لکھا ہے کہ آج حق بات کہنے کا سلیقہ ہم سے جاتا رہا اور موقع شناسی اور مردم شناسی سے بالکل محروم سے ہوتے جارہے ہیں حالاں کہ قرآن کریم واحادیث نبویہ میں اس کا بہت بڑا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اسی لیے ہماری دعوت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اعتراضات کے جوابات دینے کی طرف متوجہ نہ ہوں اور اپنے کو ان سے جاہل بنالیں اور سکوت اختیار کریں اور اپنے کام کو بڑھانے میں لگے رہیں ۔ اس کام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ معترضین کو مطمئن فرمادیتے ہیں ۔ (مکاتیب ۱/۱۱۱) ۔ شعر

فَاصبِرۡ لَهَا غَيۡرَ مُحۡتَالٍ وَّلَا ضَجِرٍ ... فِيۡ حَادِثِ الدَّهۡرِ مَا يُغۡنِيۡ عَنِ الۡحِيَلِ

(➡) منزل انتظار یعنی توجیہات کی جانب

ہمیں انتہائی حیرت ہے اس مسئلہ میں ''ضلالت'' جیسے لفظ کے استعمال پر، کوئی اور لفظ اور کوئی اور تعبیر بھی تو اختیار کی جاسکتی تھی جس سے سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی، کیا دبستان

علم وادب میں الفاظ کی کوئی کمی ہے یا مزاج فطرت میں کنجوسی ہے!!اور اس سے بڑھ کر حیرت بے پڑھے لکھے لوگوں کے بلاسوچے سمجھے ان کے ردعمل پر ہے کہ دار العلوم سے فتویٰ کیا حاصل کیا کہ وہ اس کی اشاعت میں اس طرح مصروف ہوگیے گویا ان کے یہاں عنداللہ یہی سب سے بڑی قربت ہے!!اہل علم وفتوی کو یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ بعض لوگ ''ہمیں بلی کا بکرا'' بنانے کی فراق میں ہوتے ہیں، وہ مسئلہ پوچھ کر فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عقبہ بن مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول لوگوں کے اس طرح کے عمل کے بارے میں نقل کیا ہے فرمایا ''اَتَدْرِیْ مَایُرِیْدُ هٰؤلاءِ ؟ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّجعلُوْا ظُهُوْرَنَا لَهُمْ اِلٰی جَهَنَّمَ ''(اصول الافتاء ۱۴ عن جامع بیان العلم وفضلہ ۳۱۶)۔

ہمارا صحیح احساس یہ ہے کہ روزانہ کے مطالعہ کے بعد جہالت میں اضافہ نظر آتا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ آدمی صحیح معنی میں عالم اور مفتی اس دن کہلاتا ہے جس دن اس کا جنازہ اٹھتا ہے کیوں کہ اب مزید مطالعہ سے جہالت ظاہر ہونے کا دروازہ بند ہوگیا اور اب پچھلی زندگی کے علوم کا وہ عالم ہوگیا اس منزل پر پہنچے کے بعد وہ اس کا مستحق بنتا ہے کہ اسے عالم ومفتی کہا جائے۔لیکن افسوس وہ اب اپنے کو عالم یا مفتی سننے سے رہا۔ذیل کے اقتباسات پڑھیے اور عبرت حاصل کیجیے۔

مقام عبرت

علم ایک ایسا سمندر ہے جو کسی شخص کی پوری زندگی ہڑپ کرنے جانے کے بعد بلکہ اپنی قیمت میں مجموعی کئی انسانوں کی زندگیاں لے لینے کے بعد بھی اپنا کنارہ نہیں دکھاتا، یہ ایک حقیقت ہے نہ کہ مبالغہ۔حضرات اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ چکے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سہمے سہائے ہوتے تھے۔اور ان کی زبانوں پر تالے پڑے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احتیاط فی القرآن کی مثال دیکھیے، جب ان سے آیت

قرآنی ''وَفَاکِهَةً وَّاَبًّا''میں ''لفظ ابا'' کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا اگر میں قرآن میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہ ہو تو نہ آسمان مجھے سایہ کرے اور نہ زمین مجھے اپنے پر جینے دے '' اَیُّ سماءٍ تُظِلُّنِیْ وَاَیُّ اَرْضٍ تُقِلُّنِیْ اِذَا قُلتُ فِی کِتَابِ اللہِ مَالَا عِلْمَ لِی بِہٖ'' (مرقات ۱/ ۳۱۴)۔ علامہ زمخشری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس وقت سوال کیا گیا جب وہ منبر پر تھے تو جواب میں فرمایا میں نہیں جانتا تو سائل نے کہا منبر پر چڑھے ہو اور نہیں جانتا کہتے ہو! تو آپؓ نے فرمایا میں اپنے علم کے بقدر ہی چڑھا ہوں اگر اپنی جہالت کے بقدر چڑھتا تو آسمان تک چلا جاتا۔ ''اِنَّ عَلِیًّا کَرَّمَ اللہُ وَجھَہٗ سُئِلَ عَنْ شَیْئٍ وَھُوَ عَلَی المِنْبَرِ فَقَالَ لَا اَدْرِی فَقِیْلَ کَیْفَ تَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ وَاَنْتَ طَلَعْتَ فَوْقَ المِنْبَرِ فَقَالَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اِنَّمَا طَلَعْتُ بِقَدْرِ عِلْمِیْ وَلَوْ طَلَعْتُ بِمِقْدَارِ جَھْلِیْ لَبَلَغْتُ السَّمَاءَ'' (مرقات ۱/ ۳۱۴)۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو کتنے سارے مسائل میں دوسرے حضرات سے جاننے کے بعد فرمایا ہے''لَوْلَا فُلانٌ لَھَلَکَ عُمَرُ'' مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ حتی کہ مہر کے مسئلہ میں ایک بڑھیا کے اختلاف کرنے اور اس سے مسئلہ جاننے پر فرمایا '' کُلُّ النَّاسِ اَعْلَمُ مِنْ عُمَرَ حَتّٰی الْعَجَائِزَ '' عام حضرات اس کو سیرت خلفائے راشدین (۷۰) پر دیکھ سکتے ہیں۔ جب امام مالکؒ سے ۴۰ مسائل پوچھے گئے تو انہوں نے صرف ۴ کے جوابات دیے اور بقیہ ۳۶ کے بارے میں فرمادیا مجھے معلوم نہیں '' اِنَّ مَالِکاً لَمَّا سُئِلَ عَنْ اَرْبعِیْنَ مَسْئَلَةً فَاَجَابَ عَنْ اَرْبَعَةٍ وَقَالَ فِی سِتٍّ وَّثَلَاثِیْنَ لَا اَدْرِی '' (مرقات ۱/ ۳۱۴)۔ یہ تو کچھ صرف فقہی جزئیات کے متعلق لاعلمی کا حال ہے اور وہ بھی اتنے بڑے حضرات کا، غور کیجیے پوری شریعت اور پورے دین کے علوم کے بارے میں اگر ان

سے پوچھا جاتا تو کیا فرماتے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں اسکا علم نہیں تھا، نہ وہ ان سے جاہل تھے، نہ وہ کتمان علم کے مرتکب تھے بلکہ وہ مناسب موقع کو سمجھتے تھے کہ کس وقت کس کے لیے کس جگہ کون سا مسئلہ بتانے کے لائق ہے اور کون سے مسئلہ میں خاموشی بہتر ہے جس کو صیانت علم کہتے ہیں تب ہی تو آدمی فقیہ بنتا ہے اور حکیم کہلاتا ہے اور عمر تو وہ تھے جن سے نبوت کی بو آتی تھی۔ (لو کان بعدی ۔۔۔ الحدیث) جب ان جیسوں کو توجہ کی ضرورت ہوسکتی ہے تو ہماری ضرورت کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے۔ بس یہی بات سمجھانے کے لیے یہ اقتباسات پیش کیے ہیں۔

اہل علم حضرات کی توجہ

اہل علم کی نظر کو اور ان کے علم کو چاہیے کہ ایک تو زبان عربی کی وسعت کو اور دوسرے علوم اسلامیہ کی عظیم وسعتوں کو اپنے زیر نظر اور زیر علم رکھے نہ صرف ان کی وسعتوں کو بلکہ ان کی گیرائی و گہرائی کو بھی اور بہ طور خاص ان علوم کی دو جانب یعنی دو قسموں کو بھی یعنی علوم ظاہرہ یعنی علم شریعت اور علوم باطنہ یعنی علم طریقت کو تاکہ کسی مسئلہ میں فیصلہ لینے میں نہ تردد کے شکار ہوں نہ پسپائی کے۔لہٰذا ہم اس کے دونوں جز کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

علوم اسلامیہ کی وسعت و گیرائی کے شواہد

علامہ سیوطی اور ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث شریف ''لِکُلِّ اٰیَۃٍ مِنْھَا ظَھْرٌ وَبَطْنٌ '' کے تحت علماء سلف وخلف کے اقوال بیان کیے ہیں۔ مثلاً ''قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ ،لِکُلِّ اٰیَۃٍ سِتُّوْنَ اَلْفَ فَھْمٍ ''اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے'' لَوْشِئْتُ اَنْ اُوْقِرَ سَبْعِیْنَ بَعِیْرًامِنْ تَفْسِیْرِ الْقُرْاٰنِ لَفَعَلْتُ '' وَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ مَامِنْ اٰیَۃٍ اِلَّا عَمِلَ بِھَاقَوْمٌ وَلَھَا قومٌ سَیَعْمَلُوْنَ بِھَا (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۲۳۶ومرقات ۱/ ۲۹۲)۔

قَالَ بَعضُ السَّلَفِ: سَلُوْنِي مَاشِئتُمْ اُجِبْ لَكُمْ مِنَ القُرانِ (نبراس سرگودھا۴۳۹)۔

شعر: جَمِيْعُ الْعِلْمِ فِي القُرآنِ وَلٰكِن -- تقاصَرَ عنهُ اَفهَامُ الرِّجالِ۔ (نبراس)۔

ابونعیم میں حدیث شریف ہے ''القرانُ ذَلُوْلٌ ذُوْوُجوهٍ فَاحمِلُوْهُ عَلَى اَحْسَنِ وُجُوْهِهٖ '' ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح کی ہے ومعنی ذلولٍ سَهَل حِفظُه وَفَهمُهٗ حَتّٰى لَايَقصُرُ عَنْه اَفهامُ المُجتَهِدِينَ. وَمَعنٰى ذُو وُجُوهٍ اَنَّ بَعْضَ جُمْلِهٖ يَحْتمِلُ وُجُوْهًا مِنَ التأويلِ --- وَمَعنٰى فَاحمِلُوْه الخ اِحمِلُوْهُ عَلٰى اَحْسَنِ مَعانِيْهِ--- (مرقات ۱/۲۹۲)۔ وَلِذَا قَالَ الشَّافِعِي: كُلُّ مَا حَكَمَ بِهٖ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهٗ مِنَ القُرانِ. وَقَالَ جَمِيْعُ مَا تَقُوْلُهُ الْاَئِمَّةُ شرحٌ للسُّنةِ وَجَمِيْعُ السنةِ شَرحٌ لِلْقُرْانِ (مرقات ۱/۲۴۰) اور قرآن محکم کے بارے میں ہے ''لاتَنقَضِي عَجَائِبُهٗ وَلَا يَخلَقُ عَلٰى كَثرَةِ الرَّدِّ''

علوم اسلامیہ کی وسعت و گیرائی پر دال یہ اقوال آپ نے ملاحظہ فرمائے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی ایک مثال سے وضاحت بھی ہوجائے۔تو ملاحظہ ہو قرآن حکیم کا ارشاد ہے ''اِنَّ اللهَ لَايَغفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ '' (سورۃ نساء ۱۱۶) علمائے متکلمین نے اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ''مَادُوْنَ'' سے تین مسائل مستنبط کیے۔ (۱) گناہ کبیرہ مع التوبہ (۲) گناہ کبیرہ بلاتوبہ (۳) گناہ صغیرہ۔ یہ تینوں معاف کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک مسئلہ ہوا۔ دوسرا مسئلہ: کبیرہ بلاتوبہ کا معاف نہ کیا جاسکنا۔ تیسرا: گناہ صغیرہ پر بھی معاف نہ کرتے ہوئے سزادیا جاسکنا۔ (شرح عقائد ۸۵/۸۶) آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ الفاظ قرآن میں کس قدر وسعت اور گیرائی ہوتی ہے۔ بس ہمیں اس طرح سمجھ سے کام لینا ہے۔

علوم قرآنی کی جو ترجمانی مذکورہ بالا اقوال میں کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی آب وتاب کے سامنے مادی آفتاب ماند، اس کی بلندیوں کے سامنے مادی آسمانوں کی بلندی

ہیچ اس کی گہرائی کے سامنے سمندر کی گہرائی معمولی ہے۔ یہ تو ان علوم کی وسعت و گیرائی کے شواہد تھے اب آیئے اس کی خصوصی دو تقسیم معلوم کرتے ہیں۔

علوم ظاہرہ و باطنہ کی باریک نزاکتیں

علم ظاہر یعنی فقہ کا علم (شریعت) اور علم باطن یعنی تصوف وغیرہ کا علم (طریقت وتہذیب) دونوں ہی دین کے ایسے اجزاء ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کے ملانے سے ہی نہ صرف دین بنتا اور سنورتا ہے بلکہ اسی سے حقیقت دین آشکارہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان کو جدا کردے تو کیا حال ہوگا وہ ہم چند سطور کے بعد امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بتائیں گے۔ ہم پہلے دونوں کی طرف اشارہ کرنے والی حدیث پیش کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے" اَلعِلمُ عِلْمَانِ : فَعِلمٌ فِی الْقَلْبِ فَذَاكَ العِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَاكَ حجۃُ اللہِ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى اِبْنِ اٰدَمَ "۔ (رواہ الدارمی) جس میں علم قلب کو نافع اور علم لسان کو ابن آدم پر حجت بتایا گیا ہے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے دونوں کا محل اس طرح متعین کیا ہے کہ اول کا محل علم باطن ہے اور ثانی کا علم ظاہر۔ پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ علم باطن کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے جب ظاہر کی اصلاح ہو جیسا کہ علم ظاہر کی تمامیت اس وقت ہوتی ہے جب باطن کی بھی اصلاح ہو۔ دیکھیے دونوں کو جمع کرنے کی اہمیت ثابت ہوئی۔ اور امام مالکؒ مزید تفصیل سے یوں بیان کرتے ہیں " قَالَ الْاِمَامُ مَالِك : مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتصَّوَفْ فَقَدْ تفسَّقَ، وَمَنْ تَصَّوَفَ وَلَمْ يتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ، وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَد تحقَّقَ " (مرقات ۱/ ۳۱۳)۔ یعنی فقہ (علم ظاہر) بغیر تصوف (علم باطن) کے فسق ہے اور تصوف بغیر فقہ کے زندیقیت ہے اور دونوں کو یکجا کرنا حقیقت دین ہے۔ ابو طالب مکی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ دونوں علم اصلی ہیں کوئی بھی دوسرے

سے مستغنی نہیں۔ ملاحظہ فرمایا کہ دونوں علم مجتمع ہیں۔

سمجھیے کہ ان میں اجتماع بھی غضب کا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور ان میں افتراق بھی کم نہیں۔ اگر افتراق نہ ہوتا تو تقسیم وجود میں نہ آتی۔ لہٰذا ان میں اجتماع و افتراق دونوں ہیں۔ اس اجتماع و افتراق کو اس کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا اہل بصیرت کا کام ہے، یہ وہ پل صراط ہے جس پر سے گزرنا انہی کو میسر ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں علم چاٹنے میں صرف کی ہوں۔ عوام حضرات کا اسے سمجھے بغیر کسی بھی عالم دین کے بارے میں لب کشائی کرنا درست نہیں۔ ان کے اجتماع و افتراق کو آسانی سے سمجھنا ہو تو اسلام و ایمان کی مثال سے سمجھیے۔

(⬅) امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ ایمان و اسلام آیا دونوں ایک ہیں یا الگ الگ پھر اگر دونوں ایک ہیں تو کیا اسلام ایمان سے الگ ہو کر پایا جاتا ہے یا نہیں، ''فَقِيْلَ انهما شئٌ واحدٌ. وقيل انّهما شَيئانِ لايَتوصَلانِ. وَقِيْلَ اِنهما شيئانِ ولكن يَرتبطُ اَحدُهُما بالاخرِ'' ایک قول ہے کہ دونوں ایک ہیں دوسرا قول ہے دونوں دو الگ الگ ہیں۔ تیسرا قول ہے کہ ہیں تو دونوں الگ الگ لیکن وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ پھر تین طرح کی بحثیں ذکر کی ہیں۔ ایک مقتضی لفظی کی۔ دوسری مصداق شرعی کی۔ تیسری دنیا و آخرت کے لحاظ سے دونوں کے حکم کی۔ (احیاء علوم الدین ص ۱۲۱ جلد اول الفصلُ الرابعُ مِن قواعدِ العقائدِ فِی الایمانِ والاسلامِ وَمَا بَینَہُمَا مِنَ الاتصالِ وَالانفصالِ) سمجھیے ''اِجْتماعُهما مِن وَجهٍ اَی بِحسبِ الصِدقِ. وَاِفترا قُهما مِن وَجهٍ اَی بحسبِ المفهومِ'' (➡)

لہٰذا علم ظاہر و باطن کے افتراق و اختلاف کو تقابل سمجھنا اور انہیں مقابل ٹھیرانا نہ صرف کم فہمی کم ظرفی ہے بلکہ کم علمی بھی ہے۔ کیوں کہ افتراق کے لیے تضاد ضروری نہیں کہ انہیں ایک دوسرے کا مقابل بنایا جائے مقابل بنانے کے لیے تضاد ضروری ہے۔ (⬅) یعنی ایک شئ کا

دوسری شئی کا غیر ہونا اور ایک کا دوسرے کا ضد ہونا دونوں میں فرق ہے۔ مثلاً فوق کی ضد تحت سفید کی ضد سیاہ لیکن فوق کی نسبت یمین وشمال سے یا سفید کی نسبت سرخ سے ضد کی نہیں بلکہ غیریت کی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ شریعت اور طریقت میں ایک نسبت تو عام خاص من وجہ کی ہے اور ایک نسبت تساوی اور اتحاد کی ہے، مفہوم کے اعتبار سے عام خاص کی اور صدق کے اعتبار سے اتحاد کی۔ پہلے مفہوم کے اعتبار سے نسبت اور صدق کے اعتبار سے نسبت کا مطلب سمجھیے۔ نسبت کا ایک اعتبار تو مفہوم کے لحاظ سے ہوتا ہے (مفہوم یعنی معنی لغوی) اور دوسرا اعتبار صدق واطلاق کے لحاظ سے ہوتا ہے (صدق یعنی مصداق) مفہوم کے اعتبار سے نسبت کا لحاظ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہ دو چیزوں میں سے ہر ایک میں کسی ایسی چیز کا لحاظ کیا جائے کہ جس کا دوسری میں لحاظ نہ کیا جائے اور کسی دوسری چیز کا لحاظ دونوں میں کیا جائے۔ ''اَیْ بِحَسبِ المفهُومِ وَهُوَ اَن يُعتبرَ فِي كلٍ مِنهما شيئٌ لَايُعتبرَ فِي الاٰخرِ وَيُعتبرَ فِي كِليهِما شيئٌ اٰخرُ'' (شرح نخبہ علی قاری ص ۸۸)

اور صدق کے اعتبار سے نسبت کے لحاظ کا مطلب یہ ہے کہ ایک قضیہ کا حمل دوسرے قضیہ پر کیا جائے چاہے وجوداً چاہے عدماً۔۔۔ اس تمہید کے بعد سمجھیے کہ شریعت اور طریقت دونوں میں ہی ''تقرب الی اللہ'' کی شرط ہے لہٰذا دونوں تقرب کے معنی ومفہوم میں جمع ہیں (مادۂ اجتماع یعنی عام)۔ اور شریعت میں اطاعت ''ظاہری'' شرط ہے اور طریقت میں اطاعت ''باطنی'' شرط ہے۔ لہٰذا اس مفہوم میں دونوں جدا جدا ہیں (مادۂ افتراق یعنی خاص)۔ یہ ہے مفہوم کے اعتبار سے عام خاص من وجہ کی نسبت جس سے ایک وجہ افتراق کی نکلتی ہے۔ وَاِن تَشَارَ كَافِي بَعضِهَا فَبينهُمَا عمومٌ وخُصوصٌ مِن وجهٍ لَافِي جَمِيعِ الذَّاتِيَاتِ (شرح نخبہ ص ۸۸)

لیکن صدق کے اعتبار سے دونوں میں اتحاد وتساوی کی نسبت ہے۔ کیوں کہ ایسا نہیں ہے کہ جو عالم شریعت (صاحب شریعت) ہو وہ عالم طریقت (صاحب طریقت) نہ ہو یا اس کا

برعکس بلکہ جو صاحب شریعت ہے وہ صاحب طریقت بھی ہے اور اس کا برعکس بھی۔ بالکل اسی طرح کہ جو شخص مسلم ہے وہ مؤمن بھی ہے اور اس کا برعکس بھی۔ ایسا نہیں کہ کوئی مسلم ہو اور مؤمن نہ ہو یا مؤمن ہو اور مسلم نہ ہو باوجودیکہ دونوں کے مفہوم میں مغایرت ہے " فَالایمانُ لَایَنفكُّ عنِ الِاسلامِ حُكماً فلایَتغایرانِ أی لا یَصِحُّ فِی الشرع انه یُحکمَ عَلی احدٍ بانه مُؤمنٌ وَلَیْسَ بمسلمٍ او مُسلمٌ وَلَیْسَ بمؤمنٍ " (شرح عقائد ۹۵)

حضرت امام غزالیؒ نے ان لوگوں کے خیال کو بھی رد کیا ہے جو شرعی علوم اور عقلی علوم میں تعارض سمجھتے ہیں۔ فرمایا " کچھ حضرات کا خیال ہے کہ عقلی اور شرعی علوم میں اس حد تک تعارض ہے کہ ان کے درمیان جمع کرنا ممکن ہی نہیں ہے، یہ احمقانہ خیال ہے اور صاحب خیال کے ذہنی افلاس کی دلیل ہے۔ (احیاء ج ۳) تو ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب ان علوم میں تطبیق ممکن ہے تو شرعی دو علوم میں تطبیق کیسے ناممکن ہوگی؟ اور ایک جگہ لکھا ہے کہ اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ قلب کا جلاء اور اس کا تصفیہ بندے کی ذمے داری ہے اور علماء ظاہر (فقہاء) بھی اس طریقے کے منکر نہیں ہیں (احیاء ۳)۔ لہٰذا دونوں علوم کو متعارض سمجھنا درست نہیں ہیں، دونوں کا لحاظ ضروری ہے " اِنَّ لِكلٍ مِنَ الْمَقامَینِ حقٌّ "۔ بلکہ یہ تو شریعت وطریقت کو جمع کرنا ہے جس کو حقیقت کہتے ہیں۔ آج کی تبلیغ صرف تبلیغ نہیں بلکہ وہ گلدستہ اور معجون مرکب ہے اعلیٰ درجہ کی شریعت واعلیٰ درجہ کی طریقت کا۔ ہماری تبلیغ جامع شریعت وطریقت ہے جس میں تفقہ بھی ہے تصوف بھی ہے جس کو حقیقت کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ حضرت (ڈاکٹر عبدالحیؒ) فرمایا کرتے تھے دین نام ہے حفظ حدود کا۔۔۔ حقوق تمام تر شریعت ہے اور حدود تمام تر سنت ہے اور حفظ حدود تمام تر طریقت ہے۔۔۔ اگر یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں تو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں (اصلاحی خطبات ۴ر۱۷۰، ۲۷۰ دار الکتاب، دیوبند) یہی باتیں تبلیغ میں پائی جاتی

ہیں۔(➡) اسے ہم ایک آسان مثال سے سمجھاتے ہیں۔

افتراق بلا تضاد کی پہلی مثال

کوئی شخص آں حضرت ﷺ سے منقول نماز (صفت احسان پر مشتمل) کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے یعنی فقہ سے منقول نماز (بلا خشوع) کو مقابل بنا کر (سلفی اہل حدیث) ہم سے پوچھ کر مغالطہ میں ڈالے کہ بتاؤ تم کونسی نماز درست مانتے ہو! غور کیجیے سائل نے دونوں علم کو تضاد پر محمول کر کے تقابل سے ہمیں تردد میں ڈال دیا کہ جو بھی جواب دیں وہ غلط ہو کیوں کہ وہ جواب بھی تقابل پر مشتمل ہوگا حالاں کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ افتراق ہے تقابل و تضاد تو بالکل نہیں، اور ان کے اصل اجتماع کو تو بالکل ہی فراموش کر دیا کیوں کہ جو نماز حضور سے منقول ہے وہی نماز امام اعظم سے منقول ہے۔ گویا اس نے دین و ایمان ہی کو داؤ پر لگایا، یہ بہت بڑی خیانت ہے۔

افتراق بلا تضاد کی دوسری مثال

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے جس نے خشوع اختیار نہیں کیا اس کی نماز فاسد ہے، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس نماز میں حضور قلب حاصل نہ ہو وہ اس کے لیے لائق سزا ہے نہ کہ لائق ثواب۔ (تعلیق الصبیح ۱/۳۶۶)۔ ان آثار سے خشوع کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا ثابت ہوا خشوع یعنی علم طریقت۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان آثار سے جو خشوع و حضور قلب فی الصلوٰۃ کا شرط ہونا معلوم ہوا وہ اجماع فقہاء کے خلاف ہے، کیوں کہ ان کے یہاں تو صرف بوقت تکبیر تحریمہ حضور قلب شرط ہے۔ خلاصہ یہ کہ فقہاء کے یہاں خشوع شرط نہیں یہ ہے شریعت۔ اور اصحاب آثار کے یہاں شرط

ہے جس کے بغیر نماز درست نہیں یہ ہے طریقت۔ یہ افتراق ہے اجتماع نہیں رہا لیکن یہ افتراق تضاد کو مستلزم نہیں۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ افتراق سے تصادم وٹکراؤ نہ ہوگا اور تضاد وتقابل سے تصادم لازمی طریقہ پر آئے گا۔ اور اجتماع یہ ہے کہ پوری نماز میں خشوع وخضوع کی جو شرط طریقت میں ہے اس کی نفی شریعت میں نہیں ہے۔

افتراق بلا تضاد کی تیسری مثال

ایک شخص نے حضرت ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ کیا وتر واجب ہے (یا سنت ہے) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور مسلمانوں نے نماز وتر پڑھی ہے۔ صاحب مرقات فرماتے ہیں کہ انہوں نے صریح جواب نہیں دیا کہ ہاں واجب ہے (یا سنت ہے) بلکہ مواظبت بیان کی یعنی وجوب کی دلیل تو بیان کی لیکن اس کا مدلول (وجوب) بیان نہیں کیا۔ یہ بھی جواب کا ایک طریقہ ہوتا ہے کہ سوال تو حکم پر مشتمل ہو اور جواب حکم پر نہیں اس حکم کی دلیل پر مشتمل ہو۔

اس طرز عمل کی حکمت یہ ہے کہ کسی شئی پر کسی حکم کے صادر کرنے میں احتیاط کو برقرار رکھنا ہے، حدیث مذکورہ میں وہ احتیاط اس طرح کہ جب صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وتر پر وجوب کا حکم ''صراحتاً'' صادر نہیں کیا تو ہم کیسے اس کو واجب کہیں! یہ تو بات ہوئی فقہاء کی اور شریعت کی کہ ان کے یہاں (احناف) وتر واجب ہے قطع نظر اس سے کہ حدیث میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ لیکن اب آیئے صوفیہ یعنی طریقت کی طرف، تو ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ جو طرز عمل راوی حدیث سے حاصل ہوا وہی صوفیہ کے یہاں مختار ہے، وہ کسی بھی شرعی عمل کو مواظبت سے کرنے کا اہتمام رکھتے ہیں قطع نظر اس سے کہ فقہاء کے یہاں یعنی شریعت میں وہ فرض ہو کہ سنت ومستحب۔ (مرقات ۳/۱۷۵)۔

ان تینوں مثالوں کے بعد اب توجہ فرمائیں اس پر کہ کوئی شخص علم شریعت کا مسئلہ، علم طریقت کے پاس لے جائے یا اس کے برعکس کرے مثلاً دوسری مثال میں کوئی شخص دارالافتاء میں یہ مسئلہ لکھ بھیجے کہ ایک شخص کہتا ہے نماز میں خشوع فرض ہے ورنہ نماز فاسد ہوگی، یا تیسری مثال میں لکھے کہ ایک شخص مستحب عمل پر بھی مواظبت کو ضروری سمجھتا ہے جس طرح فرض پر ان کا کیا حکم ہے؟ تو یہ دونوں علوم میں تصادم وتقابل کی صورت ہوگی اور ایک طرح کی دین میں خیانت بھی ہوگی، جس سے خرابی کا اور دو علوم کے لوگوں میں اختلاف ودوری کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہوگا اور اگر مستفتی اس سے فتنہ کھڑا کرنا چاہے تو بہ آسانی وہ اس میں کامیاب بھی ہوگا، کامیاب اس معنی کر کے اس کا الزام دارالافتاء پر ڈال دے گا۔

کیوں کہ جواب تو اسی سے حاصل کیا ہے، اور دار الافتاء جو بھی جواب دے گا وہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ اور صوفیہ کے خلاف ہوگا، چاہے استفتاء میں ان کا نام مبہم رکھا گیا ہے لیکن ان کے خلاف جواب حاصل کرنے کے بعد مستفتی نام کی صراحت کے ساتھ فتویٰ کی تشہیر کرے تو دار الافتاء اور صوفیہ اور دونوں تابعی حضرات میں تصادم واختلاف ضرور ہوگا۔ لیکن یہ حربہ اتنا کارگر نہ ہوگا کیوں کہ وہ حضرات اس وقت دنیا میں بذریعہ اپنی براءت دارالافتاء کی مخالفت کرنے کے لائق نہیں، لیکن انہی کی جگہ کسی زندہ شخصیت کو مقابل لاکر یہی صورت کوئی اختیار کرے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پھر کیا صورت بنے۔

دعوت وتبلیغ میں پیش آمدہ معاملہ میں تقریباً یہی صورت پیش آئی ہے، سمجھیے زندہ کی جو مثال فرض وتقدیر کی تھی وہ حقیقی اور وجودی میں ڈھل گئی۔ اس خرابی کی ایک وجہ یہی بنی کہ بہت سے حضرات نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی الگ الگ باتوں کو لے کر مثلاً موبائل کا مسئلہ، قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا مسئلہ، دعوت وتبلیغ کے کام کو ضروری بتانے کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

الگ الگ لوگوں نے اپنے اپنے علم وسمجھ سے لکھ کر مختلف استفتاءات کو دارالافتاء پہنچایا تو وہاں سے ان استفتاءات کے مطابق جو فتاوی (مطابق فقہ حنفی) آئے تو حضرت مولانا محمد سعد کے خلاف ایک تاریخی فتنہ اس طرح کھڑا ہوگیا کہ ان کی آسمانوں کو چھونے والی قربانیوں کو یکسر بھلادیا۔

یہ بات ہم نہ تو دارالافتاء کی مخالفت میں کہہ رہے ہیں نہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی محابات میں، اگر فی الواقع وہ غلطی پر ہوتے تو اس طرح کی کاروائی کو ہم بھی نہ صرف درست سمجھتے بلکہ ضروری بھی کہتے۔ بلکہ انہیں بھی ہم ادباً یہ کہیں گے مسائل کے بارے میں بین حلال یا بین حرام کہنا نامناسب ہے کیوں کہ یہ شرعی اصطلاحات صرف ان ہی جگہوں کے ساتھ خاص ہیں جہاں شرعًا وہ امور حلال بیّن اور حرام بیّن ہوں ان کے علاوہ میں ان کا استعمال ''وَضعُ الشَّی فِي غَیْرِ مَحلِہٖ'' ہے۔

اس بارے میں تمام لوگوں سے اور کسی قدر مستفتیان سے جو اصولی غلطی ہوئی وہ یہی کہ انہوں نے شریعت وطریقت دو الگ الگ نظریوں کو اور ان کے الگ الگ ٹھکانوں یعنی مدارس اور دعوت وتبلیغ کے مرکز کو ان کے نظریات میں پائی جانے والی جہت افتراق بلا تضاد کو افتراق بالضد سمجھا، یا ان کی جہت اجتماع کو ملحوظ رکھ کر آپس میں مزاحم سمجھا، جب کہ ایسی صورت میں جہت اجتماع کو نظر انداز کر کے جہت افتراق بلا تضاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر طلب فتویٰ کے بجائے تاویلات دریافت کرنے کی ضرورت تھی چاہے پھر علماء مدارس ہی سے سہی، ہم نے اس بحث کے شروع ہی میں لکھا ہے کہ ان کے درمیان پائی جانے والی دونوں جہتیں یعنی اجتماع وافتراق کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ دونوں جہتیں موقع ومحل کے لحاظ سے اختیار کرنی چاہیے، کیوں کہ حدود فقہ صرف ظاہر تک ہیں یعنی فقہاء صرف ظاہر میں تصرف کرتے ہیں علم باطن میں وہ تصرف نہیں کرتے، ہاں وہ باطنی احوال سے بے نصیب ومحروم بھی نہیں رہتے، اور علم طریقت والوں کا

معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ ظاہر سے زیادہ باطن کو غایت سمجھتے ہیں۔لہٰذا ایسی صورت میں فیصلہ بھی بہت احتیاط سے لیا جانا چاہیے۔

تنبیہ : اہل علم حضرات کو ایسی صورت میں نہایت ہی تیقظ سے کام لینا چاہیے، اور جس طرح فتویٰ کے لیے وہ فقہی جزئیات کو مصادر سمجھتے ہیں اسی طرح سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض مسائل میں یعنی حالات میں اپنا مصدر سمجھنا چاہیے جس پر خود فقہ مبنی ہے، کیوں کہ سیرت بیک وقت فقہ اور حکمت دونوں پر مشتمل ہوتی ہے جو بڑے سنگین حالات کو بھی ایک طرف کر کے راستہ دکھاتی ہے۔جس طرح خود فقہ مشکل حالات میں اپنا راستہ ''الضرورَاتُ تُبِيْحُ الْمَحظُورَات'' کہہ کر نکال دیتا ہے۔جب اپنا راستہ نکال سکتے ہیں تو اوروں کا بھی تو نکال سکتے ہیں۔

تنبیہ نمبر دو : کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے ان سے حاصل مخفی باریک اشارات اگر مراد لیے جائیں۔جیسا کہ اہل تصوف مراد لیتے ہیں۔جس سے نصوص کے ظاہری معنی کی تردید ونفی لازم نہ آئے تو یہ طرز عمل نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ تو کمال ایمان اور اعلیٰ معرفت کی بات ہے۔کیوں کہ اس کی دونوں مرادوں میں تطبیق ممکن ہوتی ہے'' تَنْكَشِفُ عَلَى اَرْبَابِ السُّلُوْكِ يُمْكِنُ التَّطْبِيْقُ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الظَّوَاهِرِ المرَادَةِ فَهُوَ مِنْ كَمَالِ الاِيْمَانِ وَمَحْضِ العِرْفَانِ '' (شرح عقائد ۱۲۰)۔

(⬅) ہم نے تفتازانی کی جو بات یہاں نقل کی ہے اسے خود علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے علامہ تفتازانی کے حوالے سے نقل کی ہے'' قال التفتازانی فی شرحہ۔۔۔دیکھیے (الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ صفحہ ۲۳۶) اور صاحب نبراس نے اس جگہ مخفی معنی مراد لینے والوں میں بہ طور خاص صاحب فتوحات مکیہ اور صاحب حقائق تفسیر سلمیٰ کا تذکرہ کیا ہے۔(نبراس ۲۳۸)۔(➡)

چناں چہ حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر ''بیان القرآن'' میں لطائف السلوک اس کی مثال ہے۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی فکر وسوچ اور ان کے اقوال کا حال بھی اسی طرح کا ہے۔ فتدبر۔ ہاں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ ''شریعت'' جو نہ صرف مقدم ہے بلکہ اصل ہے اس کا ترک لازم نہ آئے۔ ہم ذیل میں ایک دواور مثالیں پیش کرتے ہیں تا کہ آئندہ بھی اس طرح کا مسئلہ کسی کے بارے میں پیش نہ آوے۔

افتراق بلا تضاد کی چوتھی مثال

واقعہ مشہور ہے حیاۃ الصحابہ میں بھی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر زہد کا رنگ غالب تھا، حتی کہ انہیں مدینہ المنورہ بھی چھوڑنا پڑا ان کا خیال تھا کہ ادائیگی زکات کے بعد بھی آدمی کے لیے اس کا پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے اس کے لیے استعمال جائز نہیں۔ (حیاۃ الصحابہ ۲/۳۳۲ مترجم)۔ اب بتایئے کہ اگر کوئی شخص نام مبہم رکھ کر مسئلہ کا فتویٰ طلب کرے تو دارالافتاء کا ہر مفتی دستخط کے ساتھ یہ تحریر کرے گا کہ جو شخص یہ کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے نہ پورا مال صدقہ کرنا ضروری نہ اس کے لیے استعمال کی ممانعت۔ اب اگر فتویٰ ہاتھ میں لے کر پھر نام ظاہر کرے کہ یہ ابوذر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ تو اب صحابی کو غلط کہیں گے۔ العیاذ باللہ۔ یا دارالافتاء کے فتویٰ کو؟ ظاہری بات ہے نہ فتویٰ غلط ہے نہ صحابی کا قول غلط بلکہ اب راستہ دونوں میں تاویل کا ہے۔ لیکن تاویل آنے تک تو دونوں میں سے کسی ایک کی طرف غلطی منسوب ضرور ہوگی۔ اس کا ذمہ دار کون؟ صحابیؓ یا دارالافتاء یا وہ جس نے مسئلہ کو دارالافتاء پہنچایا؟

افتراق بلا تضاد کی پانچویں مثال

حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک مرتبہ جب کھاتے دیکھا تو فرمایا عائشہ ایک دن میں ایک مرتبہ سے زیادہ یعنی دو مرتبہ کھانا اسراف ہے۔ (حیاۃ الصحابہ گجراتی ۲/ ۵۱۲)۔ اب اس میں بھی مستفتی نام مبہم رکھ کر فتوی پوچھے کہ ایک شخص ایک دن میں دو مرتبہ کھانے کو اسراف کہتا ہے جو حرام ہے تو کیا یہ اسراف ہے؟ اور یہ فعل حرام ہے؟ تو سارے مفتیان یہ لکھیں گے کہ نہ ایسا کھانا اسراف ہے نہ حرام ہے۔ اور وہ شخص اپنے قول میں غلط ہے۔ جب فتویٰ مرتب ہو کر نام ظاہر کرے اور خود مفتیان سے اس کا تذکرہ کرے کہ یہ فرمان کسی اور کا نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے تو شاید ان کی جان ہی نکل جائے اور وہ اپنے ایمان کی تجدید کو ضروری سمجھیں۔ اب اگر وہ لوگوں میں جا کر یہ کہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو غلط بتایا۔ العیاذ باللہ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا بتایا اور دستخط شدہ فتوی بھی اس لیے بتائے تاکہ لوگوں کو یقین ہو تو لوگوں کا کیا حال بنے! ایسا ہی جیسا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال سے بنا ہے۔ حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور فتویٰ بھی غلط نہیں ہے۔ غور و توجہ کی بات یہ ہے کہ ایک بھی غلط نہیں دونوں ہی باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں پھر بھی ''فتنہ'' جنم لے رہا ہے، اگر ایک بھی بات غلط ہو اور فتنہ ہو تو افسوس کی بات نہ ہو لیکن کس قدر افسوس کی بات ہو جب دونوں صحیح ہوں اور فتنہ ایسا جنم لے کہ لوگوں کا دین خطرے میں پڑ جائے۔ دراصل خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا فتویٰ طلب کیا جائے کیوں کہ فرمان نبوی کا تعلق اصحاب زہد سے ہے وہ وہاں تک رہنا چاہیے جب اسے دارالافتاء کھینچ کر لایا جائے تو یقیناً فتویٰ اور قول رسول، اور قول صحابی میں تضاد پیش آنے کی صورت بنے گی اور لوگوں کا دین اور ان کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ لوگ بس اس طرح خیانت کرتے ہیں اور

ان کی خیانت سے دار الافتاء بدنام ہوتا ہے۔ لہٰذا سیرت پر نظر رکھنے سے حکمتیں ہاتھ لگتیں ہیں اور مشکل حالات میں راہ نظر آتی ہے۔

رجال دین کے اقوال کی توجیہات

ہم نے ان رجال دین کے اقوال پر اعتراضات پیش کرنے کے وقت ہی یہ کہا تھا ذرا یاد کیجیے کہ یہ ایسے اقوال ہیں جن کی صحت پر قرآن وحدیث کی نصوص پیش نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ یہ بین خلاف شرع ہیں اور بین خلاف شرع قول کی دلیل شرع (قرآن وحدیث) میں کیسے ہوسکتی ہے، کیوں کہ شرع میں دلیل ہوتو بین خلاف شرع نہ رہے۔ دوسری بات کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ اقوال کو بھی ہم نے بین خلاف شرع مانا ہے، لہٰذا آگے ان کے اقوال کی صحت ثابت کرنے میں بھی قرآن وحدیث سے استدلال ممکن نہ ہوگا۔ لہٰذا جو طریقہ رجال دین کے اقوال کے لیے ہوگا یعنی توجیہات وتاویلات وہی طریقہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کے لیے ہوگا۔ اس سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ہوئے کم ازکم اس اعتراض کوتو واپس لیناہی بہتر ہوگا کہ مولانا قرآن شریف کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں، کیوں کہ ہم نے یہ تسلیم کرہی لیا ہے کہ ان کے کچھ اقوال بین خلاف شرع ہیں۔ اب اس کا مستقل بیان آخر کتاب میں موجود ہے۔

بلکہ جہاں تک ہماری سوچ کا مسئلہ ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے تمام اقوال میں اگر کوئی قول سنگین ہے تو بس ایک دو "ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام والا" ورنہ اس کے سوا سارے اقوال نہ سنگین ہیں نہ بین خلاف شرع۔ برخلاف اقوال رجال دین کے کہ ان میں اکثر بین خلاف شرع بھی ہیں اور سنگین بھی، لیکن پھر بھی ہم ان کی مناسب توجیہات پیش کر کے مسئلہ بے غبار کردیں گے۔

اس کی کوشش اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں ان کے عقائد، ان کے اعمالِ آخرت وغیرہ

سے ۔۔ اطمینان ہے تو ان کی کتاب زندگی کو ملحوظ رکھ کر یقین کے ساتھ ہم کہتے ہیں کہ وہ راہ راست پر ہی تھے، راہ حق سے ذرہ بھی دور نہیں تھے۔ جب ہم یہ کام رجال دین کے لیے کر رہے ہیں تو اب ان تمام حضرات کو جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بارے میں منفی سوچ رکھتے ہیں انہیں بھی نہ صرف اس سوچ سے تائب ہونا چاہیے بلکہ جو ضرر پیش آیا ہے اس کی تلافی بھی کرنی چاہیے اور تلافی کی صورت یہی ہے کہ قابل اعتماد ذرائع سے ان کے بری ہونے کا اعلان کیا جائے۔ آپ کو یہ کام ضروری اس لیے ہو جاتا ہے کہ آپ کے سامنے حق بالکل اسی راستے آیا ہے جس راستے آنے کے آپ خواہش مند تھے یعنی آپ یہ سمجھتے تھے کہ ایسے اقوال کبھی بھی آدمی کو حق پرستی پر باقی نہیں رکھ سکتے، لیکن رجال دین کے اقوال اور ان کی تاویلات سے ثابت ہو گیا کہ وہ حق پرستی پر تھے اور ہیں، بس اسی طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب حق پرست ہیں اور حق پرستی پر قائم ہیں لہ۔ (واللہ خیر حافظا. واللہ علی ما نقول و کیل)

لہ تو آیئے ہم ان مذکورہ بالا اقوال کی توجیہات پیش کریں۔ ہم بخدا کہتے ہیں یہ توجیہات اسلامی کتابوں سے پیش نہیں کر رہے ہیں (ہاں جو مل گئیں وہ نقل کی اس کا حوالہ آپ موجود پائیں گے) بلکہ ہم خود ہی اس سمجھ سے پیش کر رہے جو قرآن وحدیث کے پڑھنے پڑھانے سے اور دیگر اسلامی علوم مثلاً بلاغت وفقہ وغیرہ کی ممارست سے حاصل ہوتی ہے جس کا مشغلہ روزمرہ کا ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ شارحین کس ذوق سے ماتن کی تسامحات کو دفع کرتے اور کس طرح تشریح کرتے ہیں چاہے پھر جلالین ہو، مختصر المعانی ہو، شرح عقائد وشرح تہذیب ہو۔۔۔ اور پھر دیگر ہزاروں کتابوں کا ۴۰ سالہ مطالعہ ''نور علی نور'' کا مصداق ہو پھر دشواری کیسی؟ پچاس سال کھپانے کے بعد اتنا بھی نہ کر سکیں تو سودہ گھاٹے میں ہوگا۔ (سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا)۔

دراصل ہم نے اس پر توجہ نہیں دی کہ یہ رجال دین کیسی بڑی بات کہہ رہے ہیں جس سے ان پر کوئی سنگین حکم عائد ہو بلکہ اس وجہ قول پر توجہ دی جو اس قول کا باعث ہے، کہ ان رجال دین نے ایسی بات کیوں کہی، جب اس پر توجہ دی تو ان کا منصب دیکھا، ان کے کارنامے دیکھے، ان کا میدان عمل دیکھا۔۔۔ تو ان اقوال کی وہ توجیہات ہاتھ لگیں کہ غالب احتمال یہ ہے کہ اگر ان اقوال کی توجیہات خود انہی سے پوچھی جاتیں تو شاید یہی بتاتے جسے اس حقیر نے پیش کیں ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

تاویلات وتوجیہات

توجیہات سے پہلے ہم آپ کو اہم بات بتادینا چاہیں گے جسے علمی سخاوت وفیاضیت سمجھیں جسے امام محی السنۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ انہوں نے اس بات کا پتہ دیا ہے کہ اس طرح کی توجیہات آدمی پر کب منکشف ہوتی ہیں۔ چناں چہ انہوں نے فرمایا : '' وَقَدْ یَفْتَحِ اللّٰہُ عَلَی الْمُدَبِّرِ وَالْمُتَفَکِّرِ مِنَ التأوِیْلِ وَالمعَانِیْ مَالَا یَفْتَحُہُ عَلٰی غَیْرِہٖ. وَالتَّفہُّمُ یَکُوْنُ بِصِدْقِ النِیَّۃِ وَتَعْظِیْمِ الْحُرْمَۃِ وَطِیِّبِ الطُّعْمَۃِ '' (مرقات ۱/۲۹۶)۔ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر تاویلات ومعانی کا انکشاف فرماتے ہیں جو تدبر وتفکر اور تیقظ وتعمق سے کام لے۔ غیر مدبر ومتفکر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا اور فہم اس وقت کام کرتی ہے جب نیت صادق ہو اور تعظیم اعلیٰ درجہ کی ہو اور غذا پاکیزہ ہو۔

(۱) حضرت ابوھریرۃ ؓ کے قول کی توجیہ : جس میں انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو انبیاء علیہم السلام کے مقام پر قرار دیا تھا۔ '' قَامَ اَبُوْبکْرٍ فِی الرِدَّۃِ مَقَامَ الاَنْبِیَاءِ ''۔

توجیہ نمبر ایک : یہ ایک تشبیہ ہے جیسے شجاعت میں زید کی اسد کے ساتھ، اور اس طرح کی تشبیہ سے حقیقت ثابت نہیں ہوتی تو یہ عمل جائز ہوگا لہٰذا اعتراض بھی نہ ہوگا اور قول کا مطلب ہوگا '' قَامَ فی قتالِ المرتدینَ مقامَ الانبیاءِ وکَانَ فِعْلُہُ فعل قتال المرتدین کَفِعْلِ الانبیاءِ ''۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو : کسی امتی سے کسی عظیم کام کے صدور میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہتِ ذات۔ دوسری جہتِ امت۔ چناں چہ ولی سے صدور کرامت میں علماء اسلام نے یہی بات کہی ہے کہ کسی ولی سے کرامت کے صدور میں دخل ولی کی ذات سے زیادہ اس کے نبی کا ہے، بمعنی کارِ

نبوت جب نبی ہی کی جہت غالب ہے یا اس کا دخل ہے تو انبیاء علیہم السلام کے مقام پر ہونے میں کونسے اعتراض کی بات ہے! (واللہ اعلم) ولی اور کرامت کی بات کا حوالہ (شرح عقائد ۱۰۷)۔

توجیہ نمبر تین : علماء حضرات وارثین انبیاء علیہم السلام ہیں، لہٰذا کسی وارث کا مورث کے مقام پر کھڑے ہوکر کوئی کام انجام دینا خود اس کا مقتضی ہے، نہ کہ اس کا مزاحم۔ لہٰذا مضاف الیہ کی تقدیر ہے اَیْ "مَقَامَ وَارِثِ الْاَنْبِیَاءِ"۔ اور ابوبکرؓ تو علماء سے بڑھ کر خلفاء میں سے ہیں پھر خلیفہ کا اپنے اصل کے مقام پر کھڑا ہونا خود خلافت کا تقاضہ ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ : حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے "غیر نبی کو نبی کے ساتھ تشبّہ کیوں کر حاصل ہو" میں اس کی تفصیل کی ہے جو ہماری تینوں توجیہات پر منطبق ہوتی ہے آپ حوالہ سے مراجعت فرمالیں (ازالۃ الخلفا مترجم ۳/۱۰)۔

(۲) حضرت علیؓ کے قول کی توجیہ : قول تھا کہ جن لوگوں کی نمازوں میں وساوس وخیالات نہ ہوں وہ یہودی ونصاریٰ کی نمازیں ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ ان کا یہ قول مزاج شریعت کے خلاف ہے۔

توجیہ نمبر ایک : یہ ان تکلف پرستوں سے ہمیں آگاہ کرنا ہے جو بد باطن ہیں لیکن لوگوں کی نظروں میں ظاہری اچھے حال کو اختیار کر کے اپنا مقام چاہتے ہیں جس کے لیے وہ بتکلف خشوع اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں میں چاہے وہ وساوس نہ ہوں (جو سادہ مخلص شخص کی نماز میں ازخود پیدا ہوجاتے ہیں) پھر بھی ان کی نمازیں یہود ونصاریٰ کی نمازوں کے مشابہ ہیں۔ تو یہود ونصاریٰ کی نمازوں کے ساتھ اصل تشبیہ ان ریاکار لوگوں کی نماز کو دی گئی ہے کیوں کہ وہ بتکلف ظاہری حال کو اچھا رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی مخلص لوگوں کی نمازوں میں تو صرف ایک عضو "قلب" کا فعل نامناسب ہے کہ اس میں وسوسہ آتا ہے اور وہ بھی بلاتکلف جو خلاف شریعت نہیں ہے برخلاف ریاکاروں کے کہ ان کی تو پوری نماز ہی یعنی پورا جسم ہی ارادۂ بد کا شکار ہے۔ خلاصہ یہ کہ

مدح وتعریف کے راستے ''لاوسوسة'' برااور برائی کے راستے ''صلاۃ الیھود والنصاریٰ
''اچھا کہا گیا ہے۔(اصول بلاغت) حضرت علیؓ کی علمی بلندی اور فراست کو دیکھتے ہوئے یہ
توجیہ بچ رہی ہے۔(واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو : یہ اثر وخبر ''ذٰلکَ صریح الایمان '' کے تحت منقول ہے۔اب حضرت علیؓ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اندر ایمان کی دولت ہو اس میں غیر اختیاری وسوسہ ایمان کی علامت ہے، شیطان اسی دولت کو لوٹنے کے لیے دل پر حملہ کرتا ہے۔ ورنہ کافر کے پاس کوئی دولت ہی نہیں تو حملہ کا اور وسوسہ کا خطرہ ہی کہاں، اسی وجہ سے یہ کہاوت مشہور ہے۔ ''اَللّصُّ لَایَدْخُلُ البَیْتَ الخَالِیْ ''۔(مرقات ۱/۱۳۶) اور جو حال ایمان کا ہے وہی نماز کا بھی ہے۔

(۳) سید الطائفہ شیخ جیلانیؒ کے قول کی توجیہ: انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم بحر معرفت میں اس قدر داخل ہوگیے کہ انبیاء علیہم السلام کنارے پر کھڑے رہ گیے۔

توجیہ نمبر ایک : ہم تو اعتراض کے خلاف یہ سمجھتے ہیں کہ یہی قول دلیل ہے اس کی کہ انہیں نبی سے کم معرفت حاصل ہے۔ پھر تو اعتراض ہی منہدم ہوجائے گا کیسے؟ ملاحظہ ہو یہ بات یقینی ہے کہ نبی کو خدا کی جو خشیت حاصل ہوتی ہے وہ امتی سے زیادہ ہوتی ہے ''اِنِّی اَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ ''لہٰذا نبی پر بنسبت امتی کے خدا کی ہیبت زیادہ ہوگی، پھر تو امتی اپنی کم حاصل خشیت وہیبت کے باعث اس مقام پر داخل ہو یہ ممکن ہے جس مقام پر نبی زیادہ ہیبت کے باعث نہ جاسکے۔ جس طرح ناسمجھ بچہ اور اس کے سمجھدار باپ کا حال کہ ناسمجھ بچہ خطرات کی جگہ داخل ہوجائے گا لیکن سمجھ دار باپ داخل نہیں ہوگا۔ بات واضح ہوگئی کہ نبی کو ہی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے تو اعتراض ختم ہوگیا۔ نیز حدیث شریف میں اعلم کا لفظ بھی دیکھا ہے جو فی قولِ معرفت کے ہم معنی ہے۔ ''انا اَعلمُکُمْ باللّٰہِ وَاَخشاکُمْ لِلّٰہِ '' جب نبی کا فرمان ہی ہے کہ میں خدا کو تم سے زیادہ جانتا ہوں تو پھر مذکورہ توجیہ یقین کے درجہ میں ہوگی۔(واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو : صاحب نبراس علامہ محمد عبدالعزیز فرہاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر میں داخل ہونے سے مراد ایسے احوال ہیں جن کا انبیاء علیہم السلام سے صدور عوام کے نزدیک غیر مناسب متصور ہوتے ہیں جیسے وَجد ورقص وغیرہ باوجودیکہ انبیاء علیہم السلام میں عشق وذوق کے سمندر بہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایسے احوال سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ (نبراس ۳۳۶) (واللہ اعلم)

نوٹ : آپ ان توجیہات کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک حضرت علامہ کی دوسری اس عبداللہ کی یا تو دونوں برابر درجہ کی ہیں یا ممکن ہے اس عبداللہ کی توجیہ وزنی ہو کیوں کہ اس میں یا تو عدم انشاء اعتراض ہے یا استدلال بالحدیث بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس کو آپ عجب پر محمول نہ کریں یہی علامہ عبدالعزیز، صاحب ہدایہ، علامہ تفتازانی، ملاعلی قاری اور امام رازی ہیں اور ان جیسے دیگر چند مصنفین ہیں جنہوں نے اس بندہ کو ذوق وشعور اور تقیظ دیا ہے تو ان کے نقش قدم کا اتباع ہو پھر تعجب کیسے اور عجب کیسے جس کے صدقے کچھ کام کرلیا کرتا ہے۔ ان سے اکتساب سے خود ان کی فوقیت وبلندی ظاہر ہوتی ہے۔ مذکورہ توجیہ کی طرح یہ عبداللہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی بھی تسلی بخش بفضل خدا توجیہات پیش کرے گا۔

(۴) سیدالطائفہ شیخ جیلانیؒ کا دوسرا قول : یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نام نبوت دیا گیا اور ہمیں اس سے روک دیا گیا لیکن نبوت کا لقب ہمیں ضرور دیا گیا، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے رسول کے کلام کے اسرار سے ہمیں باخبر کیا ہے جس مقام کو ''اولیاء کے انبیاء'' کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لقب ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔ (نبراس مولوی برخوردار حاشیہ ۶ کتاب ۴۴۵) کتاب میں اس کی توجیہ موجود نہیں۔ اللہ ہمیں درست فہم نصیب فرمائیں۔

توجیہ : اس توجیہ میں دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ لقب کیوں دیا گیا۔ دوسری ان کو

لقب میں کیوں انبیاء کہا گیا؟ تفصیل اس کی یہ ہے کہ لقب کا مسئلہ اسم کے خلاف ہے، کیوں کہ لقب کا تعلق صاحب لقب کے علاوہ سے متعلق ہو کر اس سے ملقب کیا جاتا ہے جیسے کہ مذکورہ جملے میں ''اولیاء'' کی طرف منسوب ہو کر ان کے انبیاء کہا گیا ہے جس میں منسوب الیہ سے قرب و تعلق بتلانا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ انبیاء علیھم السلام میں جو دو نسبتیں (ولایت و نبوت) ہوتی ہیں ان میں ہمیں نسبت ولایت سے نوازا گیا ہے چاہے اسی میں شامل نسبت نبوت کے نام سے محروم کیا گیا ہے۔

اب دوسری چیز سمجھیے ''اولیاء کے انبیاء'' جو لقب دیا گیا ہے اس سے یہ شبہ نہ کریں کہ یہ کیسے درست ہے جب اسم نبی سے روکا گیا ہے پھر یہاں انبیاء کیسے؟ کیوں کہ یہاں اصطلاحی انبیاء مراد نہیں بلکہ لغوی انبیاء مراد ہے۔ جو نبؤ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر دینے اور پیغام پہنچانے کے ہیں یہی اعتراض کا جواب ہے اب کوئی اعتراض نہیں رہے گا، اب مطلب ہوگا جس طرح انبیاء علیھم السلام اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچاتے ہیں ہم یعنی بڑے منصب ولایت کے حامل اولیاء اپنے ماتحت اصحاب ولایت کے حق میں انبیاء یعنی پیغام پہنچانے والے ''لغوی'' انبیاء ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ شیخ کے جملے میں یہ الفاظ ہیں ''ہمیں ضرور اسرار سے باخبر کیا جاتا ہے''۔ (واللہ اعلم)

(۵) حسین ابن منصور حلاجؒ کا قول انا الحق۔ کی توجیہ :

(⬅) یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے (جیسا کہ بعض حضرات نے اس کا اظہار کیا) کہ حسین ابن منصور کو ''انا الحق'' دعویٰ کی وجہ سے حاکم وقت نے قتل کر دیا تھا پھر ان کے اس قول کا تذکرہ اس مقام پر کیسے درست ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ اس قول کی تاویلات اور اسکی تصویب پر ۲۷۸ صفحات پر مشتمل مستقل کتاب موجود ہے، مؤلف: حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴) جس پر لکھا ہے زیر نگرانی: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔ آپ صرف اس کا حرف آغاز ہی پڑھ لیجیے از شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم

العالیہ اگر تاویل درست نہ ہوتی تو حکیم الامت اسے کیسے درست فرماتے! کتاب کا نام ہے: سیرت منصور حلاج اور حرف آغاز میں لکھا ہے کہ خود حکیم الامت نے اس پر کتاب لکھی جس کا نام : القول المنصور فی ابن منصور رکھا۔۔۔ابن منصور کے قول کے بارے میں امام قشیریؒ کی رائے نقل کی ہے کہ وہ اجلۂ صوفیہ میں سے ہیں جس سے ابن حجرؒ کے قول کا رد ہوجاتا ہے (ص ۴۴) اور ابن منصور اور حضرت جنیدؒ کا عقیدۂ توحید ایک ہی تھا (ص ۴۶) اور علامہ عبدالوہاب شعرانی نے اولیاء کرام کے تذکرہ میں ابن منصور کو بھی ذکر کیا ہے وغیرہ وغیرہ (ص ۵۲)۔ نیز ہماری دونوں تاویلات بھی کس قدر درست ہے! آپ غور فرمالیں اور خود حاشیہ بھی بڑا دلچسپ ہے! (➡)

توجیہ نمبر ایک : جب معرفت خداوندی کے مقام میں بہت آگے بڑھ گیے اور اپنی ذات فنا کردی تو پھر انہیں خدا کی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تو فرمانے لگے ''انا الحق'' یہ انا الحق اسی وجود خداوندی کے پرتو کی طرف نظر کرتے ہوئے کہا جارہا ہے نہ کہ اپنی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے کیوں کہ وہ تو فنا ہوچکی تھی تو پھر اس منزل پر کچھ بچا ہی نہیں تو یہی کہا جاسکتا ہے اس کے سوا کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں بچتا، کیوں کہ اللہ تعالی کی ذات ہر خلق ہر شئ میں موجود ہے یعنی اس کا پرتو، جب یہ پرتو غالب ہوجائے تو پھر یہ حالت پیش آتی ہے [1]۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ہم نے اپنی مطبوعہ کتاب ''نہج الائمہ فی اصلاح الائمہ'' میں پیر و مرید کی معرفت میں فرق عنوان کے تحت امام رازی کے حوالے سے جو بات لکھی ہے وہ بھی قول مذکورہ کی موید ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ابو القاسم قشیریؒ نے محققین کا قول شیخ ابو سعید رحمہ اللہ تعالی کے سامنے نقل فرمایا ''مَارَاَیْنَا شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْنَا اللہَ بَعْدَہٗ'' تو شیخ ابو سعید رحمہ اللہ تعالی نے فرمایا ''ذَاكَ مَقَامُ الْمُرِیْدِیْنَ'' پھر انہوں نے مرشدین کاملین کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا ''فَاِنَّهُمْ مَارَاَوْا شَیْئًا اِلَّا وَكَانُوْا قَدْ رَاَوُا اللہَ قَبْلَہٗ'' دیکھیے مرشدین تو خلق کو دیکھنے سے پہلے ہی اس میں خالق کا پرتو دیکھ لیتے ہیں کس قدر بصیرت حاصل ہوگی! (نہج الائمہ فی اصلاح الائمہ ۸۳/۳) الحمد للہ یہ وہ کتاب ہے جس کو بڑے علماء حضرات نے ''تصنیف'' فرمایا اور لکھا ہے۔ جس کے ۶۰۰ صفحات ہیں، حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند کو ہاتھ در ہاتھ دی ہے ہماری سنوی تعطیلات شعبان ۲۰۱۸ء میں۔

توجیہ نمبر دو : توجیہ تو وہی ہے لیکن ہم اسے کتابی اصطلاح میں ڈھال کر یوں پیش کرتے ہیں۔ مخلوقات ممکن الوجود ہیں اور اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں، اور واجب کے مقابلہ میں ممکن بمنزلۂ عدم ہوتا ہے لہٰذا انہیں صرف خدا کا پرتو اور اس کا وجود واجبی ہی نظر آیا اس لیے "انا الحق" فرمایا۔ "کل ممکنٍ فھو ھالك فی حد ذاته بمعنی ان الوجود الامکانی بالنظر الی الوجود الواجبی بمنزلة العدم (شرح عقائد صفحہ ۸۱)۔ (واللہ اعلم)

(۶) اہل تصوف کے قول کی توجیہ: اہل تصوف یعنی اہل علم طریقت کا ذکر مثالوں کے ساتھ گزر چکا ہے جس سے کافی بات سمجھ لی گئی ہوگی تاہم اپنا فریضہ ادا کر لیتے ہیں۔ اعتراض تھا کہ اہل تصوف اوراد کا اہتمام فرض کے اہتمام کی طرح کرتے ہیں اور اس کے چھوڑنے کو فرائض چھوڑنے کے برابر سمجھتے ہیں۔ توجیہ یہ ہے کہ وہ اصلاح ظاہر کے ساتھ اصلاح باطن پر زور زیادہ دیتے ہیں، اس لیے وہ لوگوں کو ایسی عادت پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ اوراد و نوافل عادت سی بن جائیں جنہیں عادتاً چھوڑنا اس طرح شاق ہو جس طرح فرائض کو چھوڑنا شاق ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اوراد و نوافل کو فرائض کا درجہ شرعی طور پر دینا مقصود نہیں بلکہ ریاضت سے حاصل مزاج وطبیعت کے لحاظ سے مقصود ہے۔ کہ طبیعت خود ان کو چھوڑنا فرائض کے چھوڑنے کی طرح ناپسند کرے۔ لہٰذا ان کا مقصد شرعی نوافل وفرائض کے درجات سے نہ کوئی مزاحمت ہے نہ مداخلت۔ اور لعنت سے مراد بھی شرعی نہیں بلکہ اہل تصوف کی نگاہوں سے "لغوی" دوری مراد ہے۔ اور مندوب پر اصرار شیطان کا حصہ اس وقت بنتا جب "مندوب" پر اصرار فرائض ومندوب کی حقیقت سے ناواقف ہو کر دونوں میں "نظری" طور پر خلط کرتا، لیکن یہاں ایسا اس لیے نہیں کہ وہ شرعاً دونوں کو علی حدہ سمجھتا ہے۔

(۷) قرآن حکیم کی مثال کی توجیہ : حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ستارے سورج کو "ربی" کہنا۔

توجیہ : یہ توجیہ خود مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے مختصر جملے میں اس طرح پیش کی ہے کہ اعتراض ہی وارد نہ ہو وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن بے ایمانوں سے مخاطب تھے وہ ستاروں یا سورج کے ماننے والے تھے یا ان کا خیال ان کے معبود کا تھا تو ان مخاطب لوگوں کے عقیدہ وخیال کے مطابق ''ربی'' کہا تھا اپنے عقیدہ کے مطابق نہیں اور شروع میں ہمزہ استفہام محذوف ہے ''اَھٰذَا رَبِّیْ فِیْ زَعْمِکُمْ '' (شرح عقائد ۱۳۳ از نبراس) تا کہ ان کے غروب کے وقت یہ سمجھایا جاسکے کہ اس میں رب ہونے کی صلاحیت ہی نہیں۔

نیز آگے آیت شریفہ میں ''فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ۔۔۔'' خود حکایتاً عن ابراہیم ''اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ '' ہے تو واضح ہوجاتا ہے کہ اس سے پہلے ''ربی'' کہنا اپنی جانب سے تھا ہی نہیں یہ بات ''مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ '' کا جملہ بتاتا ہے۔ پھر اعتراض واقع ہونے کا کوئی مقام ہی نہیں البتہ ظاہر میں شبہ تھا تو مفسرین نے ''بزعم مخالف'' کی تشریح سے دفن کردیا۔ (واللہ اعلم)

(۸) جمعیت و پارلمینٹ کے پلیٹ فارم پر اعتراض کی توجیہ : اس کی توجیہ بالکل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مسئلہ کی توجیہ کی طرح ہے۔ کیوں کہ یہاں بھی مخاطب مشرک وکافر ہیں جیسے وہاں تھے۔

(۹) امام الھند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے قول کی توجیہ : جب اس کا سیاق وسباق دیکھا تو مسئلہ حل ہوگیا وہ یہ کہ عشق خدا میں منزل کی طرف بڑھنے میں ہمت وعزیمت کے اقدام کے لیے اور اس میں جان پیدا کرنے کے لیے ہے کہ اس کے قرب کی طرف ہمیشہ ہمارا سفر جاری رہے کسی منزل پر دم تو لے لیں لیکن رک نہ جائیں اور سفر کو ملتوی نہ کیا جائے۔ (تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد ۳۲۲)۔ مطلب صرف راہ عشق میں ماسوا اللہ کا مشغلہ گناہ ہے یہ ہر شخص کے بارے میں نہیں تو پھر اس میں کس کو اعتراض ہے!

رجال دین کے اقوال کی یہ تاویلات ہیں۔ ایسا نہیں کہ اتنے ہی اقوال ہیں، اعتراضات کی باتیں تو قدم قدم پر پیش آتی ہیں لیکن تاویل کر کے گزر جانا ہوتا ہے وہاں "ٹھہر کر" سوچنا اور فیصلہ لینا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ہم اور مثالیں پیش کر دیتے ہیں آپ سوچتے رہیں۔ مثلاً

(۱) حدیث شریف میں ہے۔ "اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ یَابِلَالُ بِمَ سَبَقْتَنِیْ اِلَی الْجَنَّۃِ" (ترمذی ۲/۲۰۹)۔ سوال: حضرت بلال نبی ﷺ سے بھی پہلے جنت میں کیسے؟ کیا یہ تنقیص ہے؟

(۲) حدیث شریف میں ہے "اِنَّ الشَّیْطَانَ لَیَخَافُ مِنْكَ یَا عُمَرُ" (ترمذی ۲/۲۱۰)۔ یہاں بھی سوال ہے کہ نبی سے ڈرنا نہیں اور حضرت عمرؓ سے یہ کیسے؟

(۳) مسلم عقیدہ ہے کہ امام مہدی امامت کرائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے۔ (شرح عقائد ۱۰۱)۔ نبی کی امامت غیر نبی کیسے کرا سکتا ہے؟

(۴) حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی قوم کی دعوت پر ملت کفر میں "بذریعہ مشیت خدا" لوٹنے کی بات کہی، یہ کیسے ممکن ہے؟ "وَمَا یَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ" (سورہ اعراف ۸۹)۔

(۵) "وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ" (سورہ   )۔ ایمان و شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں پھر مؤمنین کو مشرکین کہنا کیسے درست ہے؟ اس طرح کے سوالات تو بے شمار ہیں لیکن سوالات اٹھانا کمال نہیں ان کو حل کرنا کمال ہے۔

نوٹ : ہم یہاں ایک لطیفہ یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس طرح کی باتوں پر اعتراض کرنا یا ان کی تاویل کرنا کوئی مشکل کام نہیں علماء حضرات تو جانتے ہی ہیں۔ عوام بھی سمجھتے ہیں۔ ہمیں

حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے عقیدت مند شخص نے کہا کہ لوگ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں اگر ہم بھی ان پر اعتراض کرنا چاہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن خواہ مخواہ دین برباد کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم ہی نے پوچھا، مثلاً کیا؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگ ''منتخب احادیث'' کتاب کی تعلیم سے روکتے ہیں تو ان پر حدیث شریف (کی کتاب اور وہ بھی مستند کتاب) پڑھنے سے روکنے کا اعتراض لازم آیا یہ کتنا بڑا گناہ ہے؟ بلکہ اس پر دوسرا اعتراض بنتا ہے ہم نے پوچھا کون سا؟ تو کہا کہ جس چیز کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں اس کے انکار پر اتنا اصرار خلاف شریعت ہے ہاں اگر دینی ضرر ہو تو الگ بات ہے یہاں تو دینی فائدہ ہے پھر بھی اس کے انکار پر حرام و ناجائز پر انکار کی طرح قائم رہنا یہ خود غیر شریعت کو شریعت سمجھنا ہے کیا یہ دین میں مداخلت کے مرادف نہیں؟ معلوم ہوا۔ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی باتیں کوئی گمراہی کی نہیں وہ اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں البتہ اسے اس نظریہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے

حضرت مولانا سعد صاحب پر ہوئے اعتراضات کے جوابات

یارب صل وسلم دائما ابدا علی حبیبك خیر الخلق کلھم

لکھنے اور پڑھنے سے پہلے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ دعوت وتبلیغ کے میدان میں موجودہ فتنہ سے نکلنے کی صورت پیدا فرما دیں، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کب یہ نہیں چاہتے کہ امت اس سے نہ نکلے، آدمی اس کے لئے رات بھر عبادت اور اس کی دعا کرتا رہے لیکن دعا سے فارغ ہو کر کوشش نہ کرے تو شاید وہ کامیاب نہ ہو کیوں کہ کوشش شرط ہے۔ جو اسباب میں سے ہے اور اسی اعتراض کے جواب کا تو قرضہ ہم پر ہے۔

اب کیا کوشش کرے؟ جواب کوشش یہ کرے کہ دل کو ذاتی اغراض سے پاک کر لے پھر حق بات کو تلاش کرے، پھر حق بات کو چاہے کڑوی ہو قبول کرے یہ ہے کوشش ورنہ اللہ تعالیٰ

کسی کا ہاتھ پکڑ کر نہ حق پر کھڑا کریں گے اور نہ اس فتنہ سے نکالیں گے۔ ابوطالب کی یہی خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہے انہوں نے ذاتی غرض نہیں چھوڑی، ایک طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت دیتے، دوسری طرف قوم عار دلاتی جس کی وجہ سے وہ کلمہ نہ پڑھ سکتے بالآخر انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ میں عار کو اختیار کرتا ہوں اور اسے جہنم پر ترجیح دیتا ہوں " اِخْتَرْتُ الْعَارَ عَلَى النَّارِ " جب بندہ خود ہدایت نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے چاہیں گے!! یہی عار ہے جو آدمی کو دین پر چلنے سے بھی مانع ہوتی ہے اور حق کو قبول کرنے سے دور رکھتی ہے، چاہے پھر کسی بھی قسم کی عار ہو۔ "اللھم احفظنا من ذلك"۔

لہٰذا حق اختیار کرکے ہر مسلمان سے اس طرح محبت، اکرام، ہمدردی اور خیر خواہی سے پیش آئے جس طرح ہمارے دین کا تقاضہ ہے۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح کہ "اللہ تعالیٰ کے سامنے روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو بتکلف روؤ یعنی رونے کی شکل ہی بناؤ بس ہر مسلمان بھائی سے اکرام و خیرخواہی سے پیش آؤ نفس مانے تب بھی نہ مانے تب بھی۔

حضرت ملا علی قاری۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے انتہائی بڑی بات لکھی ہے آپ تصور کریں کہ ثقلین یعنی تمام مسلمان جنات اور تمام مسلمان انسان کے اچھے کاموں کا مجموعہ کتنا بڑا ہوگا اس مجموعہ کو ایک طرف رکھو اور کسی مسلمان کے دل کو خوش کرنے کا عمل ایک طرف رکھو۔ تو مسلمان کو خوش کرنے کا عمل بڑھ جائے گا! یہ ہے مسلمان کی شان اس پر عمل کرکے دیکھیے۔ "تَطْيِيْبُ قَلْبِ الْمؤمِنِ اَفضلُ مِنْ عَمَلِ الثَّقَلَيْنِ" (مرقات شرح مشکوۃ ۴/۴۴)۔

جوابات سے پہلے انتہائی اہم امور/اصول

حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گیے ۷۰ اعتراضات کے سیدھے جوابات/ توجیہات سے پہلے ہر قاری و معترض کو ذیل کے اہم ترین امور بلکہ کہیے اصول ضرور ملحوظ رکھنے

چاہیں، جن کے بغیر توجیہات کو پڑھنا ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ یہ وہ اہم امور ہیں جنہیں اگر آپ نے سمجھ لیا تو شاید آپ توجیہات کے منتظر نہ رہیں۔

(۱) سائل یعنی معترض نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کو لے کر خواہ مخواہ ۷۰ اعتراضات دکھا کر مسئلہ کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ یہ ۷۰ اعتراضات تین قسم میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

✿ اصل قابل اعتراضات مولانا کے صرف ۸ر ۱۰ اقوال ہی ہیں۔

قابل اعتراض بالترتیب یہ ہیں: نمبر ا۔ نمبر ۲۔ نمبر ۱۴۔ نمبر ۱۸۔ نمبر ۲۸۔ نمبر ۳۳۔ نمبر ۳۵۔ نمبر ۶۳۔ نمبر ۶۴۔ بقیہ اس لئے قابل اعتراض نہیں ہیں کہ اکثروں کی حالت یکساں ہے، صرف الفاظ کی تبدیلی سے شمار کو بڑھا دیا ہے۔

✿ بعض اعتراضات کی عبارات میں (حکایتً عن مولانا محمد سعد صاحب) ''عندی'' کی قید موجود ہے۔ جس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ معترض اتنا ناقص فہم ناقص علم ہے کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ مولانا اس لفظ سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ قول میرا ذاتی رجحان ہے میں اسے دوسروں پر لازم نہیں سمجھتا۔ جب یہ بات ہے تو اسے لے کر اعتراض کی اور اچھالنے کی گنجائش کہاں؟ معترض اگر یہ بات نہیں جانتا تو اس کی عقل وعلم پر ماتم کی ضرورت ہے اور اگر جانتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ صالح نہیں ہے اور یہ ایک قسم کی خیانت ہے۔ مثلاً وہ نمبر ہیں۔ ۳۔ ۴۔ ۹۔ ۱۳۔ ۱۹۔ ۴۲۔ ۶۸۔

بلکہ اگر کتابی اصول کو دیکھا جائے کہ بعض دفع متکلم رمصنف کسی قید کو اختصار یا ضرورتِ قلیلہ کے پیش نظر حذف کر دیتا ہے باوجودیکہ وہ معنون وملحوظ ہوتی ہے تو جن جگہوں میں یہ قید نہیں انہیں بھی اس قید ''المحذوف کالمذکور'' سے متصف مان لیں پھر تو اعتراضات کی اکثر کڑیاں ٹوٹ کر چند ہی عدد میں محصور ہو جائیں گی۔ بس یہیں سے

حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراض کا حال ''کمثل العنکبوت'' واضح ہو گیا۔

۞ بعض عبارات واقوال کو اعتراضات کا ہدف بنا کر ان کی نسبت حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف جو کی گئی ہے وہ درحقیقت حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے اقوال ہیں۔ لہٰذا ان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف اعتراض کی نسبت غلط ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۷۰ اعتراضات میں یہ تین باتیں ملحوظ رہیں اور یہ بھی کہ اب صرف ۸/۱۰ اعتراضات کے جوابات ہی مطلوب رہے۔

(۲) کسی فکر و تحریک یا اس کے سربراہ پر محض ظاہری چند اقوال کی بنا پر ضلالت یا ضال کا یا اس کے اندیشہ کا حکم لگانا۔ جو ایک سنگین حکم ہے۔ اس حکم کے لگانے سے پہلے اس پر تحقیقی نظر۔ نہ کہ سرسری۔ ڈالنا ضروری ہے کہ مشبہ بہ اور مشبہ دونوں میں علت کس قدر مشترک ہے، کیوں کہ اتحاد حکم کے لیے اتحاد علت ضروری ہے اگر دونوں میں علت متحد نہیں تو آپ کا اعتراض آپ کا فیصلہ غلط ہوگا۔

اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جن جماعتوں پر ضلالت کا حکم لگایا گیا ہے۔ ان میں معیار'' مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصحابِي' اور معرفت الٰہیہ میں حق تک رسائی ہے۔ کیوں کہ معرفت الٰہیہ کو یعنی علم توحید وصفات کو علم شریعت واحکام کی بنیاد بتایا گیا ہے (شرح عقائد ۲)۔ یہی بات علمائے اسلام نے لکھی ہے، ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ شرح عقائد میں ہے'' ۔۔۔ وَذٰلِكَ لِقُصُورِ نَظَرِهِمْ فِي الْمَعَارِفِ الْإِلٰهِيَّةِ ۔۔ (۷۶ شرح عقائد)۔ اور روح المعانی میں لکھا ہے'' وَقَالَ الراغبُ: اى مَا عَرَفُوْا كُنْهَهٗ عَزَّوَجَلَّ وَتَعَقَّبَ بِاَنَّ مَعَرفَةَ كُنْهِهٖ تَعالىٰ اى حقيقته سُبحانه لَايَخُصُّ هُولَاءِ لتعذُّرِا لوُقُوفِ على الحقِيْقةِ .. وَقِيْلَ الضَمِيْرُ لِلْيَهُوْدِ تَكَلَّمُوْا فِي صفاتِ اللهِ تعالىٰ وجَلَالِهٖ فَالحَدُوْا وَجَسَّمُوْا وَجَاءُوْا بِكُلِّ تَخْلِيْطٍ ''فنزلت وَمَا قَدَرُوْا اللهَ حَقَّ قَدرِهٖ''

(روح المعانی ۲۳/۲۴ صفحہ ۳۸۲)۔

جب کہ یہاں تو مشبہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی باتیں اعلیٰ معرفت کی ایسی ہیں جیسی مشائخ تصوف کی ۔اور'' مَاۤ اَنَا عَلَیۡہِ وَ اَصۡحَابِیۡ '' کو دیکھیں تو اہل حق کے جتنے عقائد ہیں ان میں سے ایک بھی عقیدہ ایسا نہیں جس کی مخالفت مولانا کے قول سے کوئی ثابت کر سکے ۔ رہے وہ اقوال جنہیں مدار اعتراضات بنایا گیا ہے وہ ان عقائد کے ضمن میں شامل ہی نہیں جو مدار ضلالت ہیں جنہیں بڑے علماء حضرات جانتے ہیں ۔ چناں چہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔رحمہ اللہ تعالیٰ ۔نے جو فرمایا جس کی ترجمانی حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہے ''جن مسائل کی آیات کریمہ نے صراحت کی ہے (مسائل منصوصہ) اور ساتھ ہی وہ احادیث مبارکہ سے اور سلف کے اعمال سے بھی ثابت ہے ان میں اختلاف'' اہل حق '' کا معیار نہیں ، ان کو ماننے والے اور نہ ماننے والے سب اہل السنہ والجماعہ ہیں ، کیوں کہ ایسا کرنے کا حق ہر ایک کو ہے ۔مثلاً ضرویات دین کا انکار لازم نہ آئے مثلاً فرضیت صلوٰۃ کا انکار اور ختم نبوت کا انکار نہ کرے وہ اہل حق ہیں ۔(رحمۃ اللہ الواسعہ ۱ / ۱۴۴، ۱۴۲)۔

اور ہمارے پاس اس کا قرینہ بھی موجود ہے ،وہ ہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب اور ان کے متبعین کے دینی اور مذہبی احوال اور اعمال ۔اگر ان کے مذہبی احوال واقعیہ اور اعمال دیکھیں ،ان کی عبادات ،ان کا زہد و تقویٰ ،ان کے اخلاق و کردار ،ان کی صفات ،ان میں فرائض شرعیہ و سنن و آداب کی رعایت ،ان کی دینی قربانیاں ،ان کی شب و روز کی مصروفیات ،ان کے بیانات اور اپنے متبعین کو تعلیم وغیرہ ،تو کبھی خواب میں بھی ضلالت یا شبہ ضلالت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

بلکہ بیداری کی حالت میں اس پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ وہ سب ایسی روحانی طاقت پر مشتمل ہیں کہ اگر راستہ میں پہاڑ آ جائے تو وہ جگہ دے دے'' وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ '' اور مردہ میں جان ڈال دے ۔کیوں کہ حدیث شریف میں ہے '' اِذَا سَمِعۡتُمۡ بِجَبَلٍ زَالَ عَنۡ مَکَانِہٖ فَصَدِّقُوۡہُ ،وَاِذَا سَمِعۡتُمۡ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنۡ خُلُقِہٖ فَلَا تُصَدِّقُوۡا بِہٖ

فَإِنَّهُ يَصِيْرُ إِلٰى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ ''(مشکوۃ شریف ۲۴)۔ مذکورہ بالا آیت شریفہ اور حدیث شریف کا مختصراً خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا تو ممکن ہے لیکن کسی آدمی کا اپنی فطرت سے ہٹنا ناممکن ہے۔ یعنی آدمی اپنی فطرت کے کاموں کو نہیں چھوڑ سکتا۔۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ کسی غیر مسلم کا اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونا، جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا یا پہلے سے کسی مسلمان شخص کا اپنے گناہوں کو اور بری عادتوں کو چھوڑ نا، جیسے مشائخ تصوف نے اور موجودہ دعوت وتبلیغ نے لوگوں پر اثر دکھایا وہ مذہب یا وہ گناہوں کی عادت فطرت کے درجہ میں ہوتے ہیں جس کے بارے میں حدیث شریف میں بتایا ان کا چھوڑنا ناممکن ہے، لیکن اگر کوئی انہیں چھڑائے اور یہ انقلابی کام انجام دے تو سمجھو اس میں روحانی طاقت ہے اسی کو کرامت کہتے ہیں، کہ کرامت سے ہوسکتا ہے، لیکن یہ معنوی کرامت ہے، نہ کہ حسی۔

اور یہ (لوگوں میں دینی جان پیدا کردینا) وہ طاقت ہے کہ اس کے مقابلہ میں بقول علمائے اسلام اہل اللہ کی کرامات ہیچ ہیں۔ کیوں کہ وہ کرامت معنوی ہے اور یہ کرامت حسّی ہے اور معنوی کا درجہ حسّی پر بلند ہے۔ کیوں کہ حسی کرامت میں استدراج کا احتمال ہے اور معنوی میں یہ احتمال نہیں (کرامات شاہ امداداللہ ص ۱۱ وص ۱۴)۔

پوری بات کا خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے احوال سے معلوم ہوا کہ ان کے احوال دینیہ معنوی کرامت کے درجے میں ہیں، ان کی کرامت نہ سہی کام کی تو کرامت ہے! پھر ''ضلالت'' کیسی؟ علماء حضرات اس بات کو ہماری ناسمجھی یا مبالغہ وزیادتی سمجھنے سے پہلے کسی شخص کو پہچاننے کی بھی زحمت اٹھائیں، کیوں کہ جس طرح ہم نے یہ بات حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بارے میں کہی ہے اسی طرح قرآن وحدیث کی روشنی میں مدارس ومکاتب کے علماء حضرات کے بارے میں بھی کہی ہے، کہ ان کی ۴۰/۵۰ سالہ تعلیمی خدمات کی طاقت بھی

کرامت ومعجزہ کی طاقت سے کم نہیں بشرطیں کہ وہ دینی تمام اصولوں کے مطابق خدمات انجام دیں، دیکھیے ہماری کتاب (نہج الائمہ فی اصلاح الامہ ۳/ ۱۳۰) میں۔ الحمدللہ ہمارا مزاج دینی ہے، جو بات حق ہے وہی کہتے ہیں۔

حضرت مولانا سعد صاحب کی باتیں اپنے دادا حضرت جی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی باتوں سے کم نہیں جن کے بارے میں شیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ان کے توکل علی اللہ کا یہ حال تھا کہ اگر ساری دنیا ان کے مخالف ہوجائے تو ان کے توکل علی اللہ میں کوئی فرق نہ پڑے اور وہ اپنی دعوت الی اللہ کو جاری رکھیں۔ (ھکذا)

(۳) کسی دوسرے کے کلام کو سمجھنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کلام کی مراد خود متکلم سے دریافت کی جائے۔ اگر متکلم سے پوچھے بغیر سامع خود ہی اس کی مراد متعین کرے تو اس میں خطا کا احتمال ضرور ہوگا۔ کیوں کہ تاویل تو شراح ان لوگوں کے اقوال کی کرتے ہیں جن سے براہ راست پوچھنے کی نوبت نہ آئی ہو ان کے انتقال کی وجہ سے، رہے زندہ لوگوں کے اقوال تو ان کی مراد خود انہی سے پوچھی جاتی ہے۔ ہم ذیل میں چند ایسے امور پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کسی کی مراد کو متعین کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

الف : فن کے بدلنے سے اصطلاحات کے معانی بدل جایا کرتے ہیں۔

ب : فقہ میں وجوب وجواز یا عدم جواز کے معنی ظاہر ہیں۔

ج : علم کلام میں جواز بمعنی ممکن وصحت اور وجوب بمعنی ثبوت ہے۔

د: نحو، صرف اور ادب میں جواز وجوب کے معنی، فقہ کے جواز ووجوب کے معنی کا غیر ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں لغوی معنی مراد ہوتا ہے۔

ھ : علم منطق میں کلمہ مقسم نہیں، بلکہ مفرد کی ایک قسم ہے جو مقترن بالزمان کو کہتے ہیں لیکن

علم نحو میں یہی لفظ مقسم بن جاتا ہے۔

و: علم ادب میں لفظ قال الگ الگ محل کے لحاظ سے الگ الگ معانی مثلاً حکم دینا۔ سوال کرنا۔ جواب دینا۔ درخواست کرنا اور کوئی کام کرنا وغیرہ میں مستعمل ہوتا ہے۔

ز: ابھی فقہ کے دو الفاظ بتائے فرض وواجب وہ ہی محاورے میں اپنے معنی موضوع لہ سے ہٹ کر استعمال ہوتے ہیں مثلاً کوئی آقا اپنے غلام کو، باپ اپنے بیٹے کو کسی کام کے ضروری ہونے کو بتائے گا تو یہی لفظ استعمال کرے گا ''علیک ھذا'' ہم بولتے ہیں مدرس کو درس سے پہلے مطالعہ فرض ہے۔ تبلیغی احباب تحریض علی تہجد کے لیے بولتے ہیں ''ہم تبلیغی لوگوں کے لیے پانچ نمازیں نہیں چھ نمازیں فرض ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فقہی اصطلاحات بھی مواقع استعمال سے بدل جاتی ہیں یعنی اپنے معنی موضوع لہ پر قائم نہیں رہتیں چاہے الفاظ وہی ہوں۔ بلکہ خود فقہ میں بھی اپنے لفظ سے معنی موضوع لہ کا تخلّف ''اخذا من الحدیث'' پایا جاتا ہے مثلاً غسل جمعہ میں وجوب کا معنی متخلف ہے۔

ح: کبھی لفظ ایک ہوتا ہے اور معنی بھی ایک لیکن وہ مستعمل ہوتا ہے دو متضاد صفات دو ذات پر۔ جیسے لفظ طائفہ۔ بڑے اہل اللہ پر مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی پر اور فاحشہ عورت پر۔ کتنا تضاد ہے!! قرآن کے الفاظ میں اس کی مثال: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور وَبَشِّرِ الْمُنَافِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یہ تو دو شخصوں پر اطلاق تھا۔

ط: اس سے بڑا تعجب یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک ہی شخص پر دو متضاد معنی ''مدح وذم'' پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً ایک سلائی کرنے والا شخص (درزی) ایک آنکھ سے کانا ہے، اسے کسی نے اپنا قیمتی کپڑا سینے کے لیے دیا سینے کے بعد صاحب لباس کہتا ہے، کاش اس کی دوسری آنکھ بھی سالم ہوتی۔ اس کا ایک پہلو مدح کا ہے کہ جب ایک آنکھ ہوتے ہوئے اتنا اچھا سیا ہے اگر دوسری بھی

ہوتی تو کتنا اچھا سیتا اور دوسرا پہلو ذم کا ہے کہ اگر دوسری آنکھ ہوتی تو کپڑا نہ بگاڑتا۔

(⬅) ی : لفظ تو ایک ہے لیکن اس کی نسبت بدل جانے سے اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں جیسے نحو میں مفرد: کبھی تشنیہ جمع کے مقابل، کبھی مرکب کے مقابل، کبھی مضاف یا شبہ مضاف کے مقابل اور کبھی جملہ یا شبہ جملہ کے مقابل بالترتیب واحد، غیر مرکب، غیر مضاف اور غیر جملہ کے لیے ہوتا ہے۔ (➡)

ک : ایک لفظ ایک معنی میں اپنی حقیقت کے ساتھ جب کسی پر بولا جائے تو وہ لفظ دوسرے لفظ کی اپنی حقیقت کے ساتھ بدل جائے اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔ جب کہ پہلا شخص کم رتبے کا اور دوسرا شخص بڑے رتبہ کا ہو۔ مثلاً "مُبَاحَاتُ العَوامِ سَيِّئَاتُ الاَبْرَارِ وَحَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ المُقَرَّبِيْنَ" (نبراس ۴۵۲) ۔جس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ لوگوں کے دینی مرتبہ کی وجہ سے "نفل نماز وذکر خدا" جو نیکی ہے برائی سے بدل جائے کیوں کہ بلند رتبہ کی نیکی تو اور بلند ہوتی ہے۔ معلوم ہوا فرق مدارج ایک مسلم حقیقت ہے۔

غور کی بات یہ ہے کہ شریعت "فقہ" میں مباح، سیّہ اور حسنہ کے مدلولات متعین ہیں، جو سیّہ ہے وہ حسنہ اور جو حسنہ ہے وہ سیہ نہیں بن سکتی پھر بھی یہاں بن جاتی ہے جو بالکل خلاف شریعت ہے۔ جب کہ اس اصول کو بھی علماء حضرات درست مانتے ہیں، تو اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے بتایا کہ یہ لوگوں کے مختلف رتبوں کی وجہ سے ہے۔ پس پیش آمدہ دعوت کے مسئلہ میں ان سب کو ملحوظ رکھا جائے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال میں کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

ہماری گہری سوچ تو ہمیں یہاں تک لیجاتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح وتربیت اور تہذیب میں بھی اصول بدلا کرتے ہیں مثلا حکمرانوں کے، مشائخ تصوف کے، ادباء ومدرسین کے، والدین کے، مختلف اداروں اور تنظیموں کے اصول۔ ایک کے یہاں جو اصول تربیت ہے ضروری نہیں کہ دوسرے کے یہاں بھی وہ اصول ہو۔ اسی طرح برعکس۔ خلاصہ یہ کہ کسی کی بات کا

صحیح مطلب سمجھنے کے لیے ان سب کا اور کتابوں میں مذکور اصول ان سب کا لحاظ ضروری ہے یہ بہ طور نمونہ پیش کیا ہے۔ کیوں کہ مخاطبین کون ہیں یعنی کس درجہ کے ہیں، خطاب کس میدان کا ہے، خطاب کس زمانہ کا ہے، خطاب صراحۃ مناسب ہے کہ کنایہ اور اشارہ میں، کلام کا کون سا جز قابل زور ہے، بات کس پس منظر میں کی جارہی ہے، مذکورہ بات مقصود قائل ہے کہ مقصود کا واسطہ ہے، کلام میں شرط وغیرہ مذکور ہے کہ محذوف، محذوف ہے تو مراد بھی ہے کہ نہیں ان سب ہی گوشوں پر دھیان دینا ہوتا ہے اور ضرب الامثال اور محاورے مزید براں۔

(۴) ہر مشن ہر تحریک والے کہ یہاں اپنے مشن اپنی تحریک کی اہمیت ایک مسلم اصول ہے، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کے یہاں اس کی اہمیت ہو یا نہ ہو۔ جب نفس تحریک کی اہمیت مسلم ہے (صغری) تو اسے دوسری تحریکوں سے بلند ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرے گا (کبری) جو معقول شی ہے نتیجہ یہ کہ وہ بلند ضرور ہوگی (بزعم خود)۔ اس سے ان لوگوں کی سوچ کا غلط ہونا واضح ہوگیا جو اس کی بیان کردہ اہمیت و بلندی کو اپنی یا دوسری تحریکوں کی مخالفت یا ٹکراؤ پر محمول کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا اصل مقصد اپنی تحریک کی اہمیت یا بلندی بتانا ہے جو ان کا جائز حق ہے، نہ مخالفت مقصود ہے نہ ٹکراؤ۔

حتی کہ وہ اس اہمیت کے خاطر مبالغہ سے کام لے تو قرآن وحدیث اس سے ممانعت اس لیے نہیں کرتے کہ خود انہوں نے اسے استعمال کر کے نمونہ دیا ہے۔ باوجودیکہ وہ تحریک اس درجہ کی نہ ہو جو مبالغہ سے جتائی جارہی ہے کیوں کہ مبالغہ کہتے ہی اسے ہیں۔۔۔۔ یہ ایک جائز اور درست عمل ہے۔ لہٰذا اہل تبلیغ کے بعض ایسے جملے جو تبلیغ کی اہمیت کے ہوں مثلاً تبلیغ کو لازم وفرض بتانا اور اسی کو اصلاح نفس کے لیے کافی بتانا وغیرہ اور جو مدارس یا خانقاہوں سے بظاہر ٹکراؤ پر دال ہیں انہیں اسی اصول سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر مقابلہ کی حقیقت سمجھ لی جائے تو کوئی خدشہ ہی باقی نہ رہے، کیوں کہ مقابلہ ومسابقہ ہم مثل اشخاص و اعمال میں مقصود ہوتا ہے مثلاً

قراءت میں اور قراء حضرات میں مسابقہ برخلاف قراء اور مقررین میں مسابقہ اور مقابلہ کہ اس کو مقابلہ نہیں کہہ سکتے بس اس طرح دعوت وتبلیغ کا معاملہ خانقاہ و مدارس کے ساتھ مقابلہ ہے ہی نہیں پھر ٹکراؤ کا خیال کیسے؟

تنبیہ : بلکہ آپ اگر کم ظرف نہیں اور حق شناسی کا جوہر رکھتے اور تبلیغی دینی نتائج وثمرات پر وسیع وتحقیقی نظر بھی رکھتے ہیں تو اس مبالغہ کو مبالغہ نہیں حقیقت پر بھی محمول کریں تو آپ کے وسیع ظرف اور حق شناسی کی دلیل ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے تبلیغ کی چند وجوہ ترجیح لکھی ہیں۔

(←) نیز بعض دفعہ مبالغہ کے طور پر دینی مصلحت کے پیش نظر کسی کام کی نسبت ''دین'' کی طرف کردی جاتی ہے تاکہ اس کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوجائے اور اس کام کی رغبت لوگوں میں پیدا ہوجائے۔ مثلاً آج کل عصری تعلیم اور جمعیت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی اہمیت بتانا۔ باوجودیکہ وہ ایک ہندوستانی ملک کے لحاظ سے ''دین کا ایک حصہ'' گردانا جاسکتا ہے بس۔ جب کہ ''تبلیغ'' تو عین دین ہے اس کے لیے ''مبالغہ و اہمیت'' کیوں نادرست ہوسکتی ہے۔

دراصل دین وشریعت کی سمجھ نزاکت کو چاہتی ہے جو ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ مثلاً ہم نے یہاں عصری تعلیم، جمعیت علمائے ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی ''حقیقت'' جو بتائی کہ یہ بعینہ نہ دین ہے نہ دین کا حصہ ہے۔ شاید بعض لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ بلکہ دینی مصلحت کے پیش نظر اسے دین بتلایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اس کی اہمیت پیدا ہو۔ یہ درحقیقت دین کے وہ اسباب ہیں جو اس میں معین ومددگار ہیں۔ یا کہیں دین کے وہ انتظامی امور ہیں جن سے دین کا نظم وبندوبست ہوتا ہے۔

کیوں کہ ہم اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک دین وہ ہوتا ہے جس میں ذرا بھی کمی وبیشی نہ ہو۔ اسی لیے محققین نے ایک قدم آگے بڑھا کر مدارس، خانقاہ اور تبلیغ کے چند امور کو بھی صرف

امور انتظام اور اسباب دین کہا ہے نہ کہ دین۔ مثلاً مدارس میں سوائے تعلیم و تعلم کے جتنے امور ہیں مثلاً عالمیت کا مروجہ نصاب، اس کا طریقۂ تعلیم، اس کا عملہ، مدرسہ کا ڈھانچہ اور اس کی ساری سرگرمیاں اور خانقاہ میں تذکیہ نفس اور ذکر کے سوا جتنے امور ہیں مثلاً اوراد کی تعداد، علی حدہ علی حدہ مرید پر پابندیاں، طریقۂ تذکیہ، مرید کی اپنے شیخ کے یہاں آمد و رفت اور حبس نفس وغیرہ۔ اور تبلیغ میں بھی بعض مقررہ اعمال، مقررہ کتب، مقررہ اوقات وغیرہ یہ سب ہی صرف اسباب دین ہیں، ان پر سب ہی لوگ جو دین کا اطلاق کرتے ہیں وہ اسباب دین ہونے کے ناطے کرتے ہیں ورنہ یہ دین نہیں بلکہ حصول دین کے نظام ہیں۔

کیوں کہ دین میں کم و کاست کی گنجائش نہیں ہوتی اور یہ سارے امور تقاضۂ وقت کی وجہ سے محل تغیر ہوتے ہیں لہٰذا بخاری شریف، مسلم شریف، جلالین شریف، ہدایہ، شامی اور دیگر کتب فتوی کو بعینہ پڑھنا پڑھانا یہ سب اصل دین سے خارج ہیں۔ چناں چہ محقق عالم دین ''امام غزالیؒ'' نے علمائے آخرت و علمائے سوء کے بیان میں ''کتب مؤلفہ'' کے بارے میں اس طرح کی بات لکھی ہے (احیاء علوم الدین ۱/ ۸۴) جس کو ہم نے کتاب میں صفحہ ۱۴۶ کے اضافہ میں بیان کیا ہے۔

بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر انہوں نے فقہاء کرام کو ''من وجہ'' علماء دنیا کہا ہے (احیاء علوم الدین بیان العلم الذی ھو فرض کفایۃ ۱/ ۲۳) جس کو ہم نے کتاب صفحہ ۲۱۲ میں نقل کیا ہے۔ اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر علمائے اسلام نے نفس عبادت کی مخصوص صورتوں کو بھی ''غیر مقصود'' کہا ہے کیوں کہ مقصود صرف اور صرف خدا کی ذات ہے۔ دیکھیے صفحہ ۱۶۴ تا ۱۸۰۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین و مذہب کی سمجھ نزاکت کو چاہتی ہے اور وہ چیز جس پر عرفاً دین کا اطلاق کیا جاتا ہے وہ اصل دین نہیں ہوتی وہ اسباب دین یا دین کے انتظامی امور ہوتے ہیں (واللہ اعلم)۔ (←) اب اسی ضمن میں ہم

آپ کواشارہ کردیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گیے ۷۰ اعتراضات میں اکثر یہی خطا ہوئی ہے۔ کیوں کہ حضرت موصوف کے اکثر اقوال میں وہ ہی مبالغہ۔ جائز حق۔ ہے پھر تو ان سارے اعتراضات کے جوابات کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے۔ جو مبالغہ پر مبنی ہیں۔

(۵) پوری اسلامی تاریخ میں چاہے وہ دور خلافت ہو کہ دور امارت، دور محدثین ہو کہ دور فقہاء یا ان کے بعد اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی بھی تحریک نے پوری دنیا کو دینی اور مذہبی تمام امور کے لحاظ سے اس طرح مسحور کیا ہو جس طرح دعوت وتبلیغ کی اس مروجہ تحریک نے۔ ہاں حضرت عمرؓ کے دور میں اسلامی حدود وسیع ہوئیں، تاتاریوں کے یہاں زازان مسلم حکمران کی وجہ سے اسلامی نظریہ شاہی بن گیا تو اسلامی حدود وسیع ہوئیں اور بعض مشائخ تصوف کے دور میں کافی دینی فوائد حاصل ہوئے لیکن پھر بھی وہ ایک محدود فائدہ تھا عالم گیر نہیں تھا، عالم گیر سحر انگیزی کی مثال صرف تبلیغ ہی نے پیش کی ہے۔

اگر اس سحر انگیزی کے اسباب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ لوگوں میں دین کی حقیقت پیدا ہونا ہے، کیوں کہ حقیقت دین کے بغیر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا ناممکن ہے، اور حقیقت دین پیدا ہوتی ہے لوگوں کی قربانیوں سے اور قربانیاں پیدا ہوتی ہیں لوگوں کے اپنے اوقات اکثر وبیشتر مسجدوں میں گزارنے سے، جہاں ان کا شب وروز تعلیم وبیانات کے ذریعہ ایمانی ودعوتی ذہن بنتا اور بنایا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عالمی سحر انگیزی انہی بیانات سے بچند واسطے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر انہی بیانات کو مجروح کیا جائے تو نہ دعوت میں جان رہے گی نہ حقیقت دین پیدا ہوگی اور اتنی بڑی انقلابی تحریک قیودات غیر ضروریہ کی وجہ سے معطل ہوکر رہ جائے گی۔ سوچیے تو سہی صرف ایک شخص کا ایک ہی عمل یعنی ایک مقتدی باوجودیکہ وہ مکمل امام کے تابع ہے ذرا انحراف کی گنجائش

نہیں لیکن پھر بھی اس کی سہوات سے درگزر کیا گیا ہے اور سجدہ لازم نہیں کیا گیا ہے اتنی چھوٹ تو اس کو بھی حاصل ہے اور یہ صرف ایک شخص کے ایک عمل میں ہے تو ایک انقلابی تحریک کو اتنا بھی درجہ حاصل نہ ہو!! اسے مکمل ایک امام کے تابع مقتدی کی طرح اور علاقے کے ادارے کے ایک مدرس کی طرح تابع ومقید تصور کرنا بھی ایک سبب ہے مسئلہ کے حل نہ ہونے کا

(٦) دعوت وتبلیغ کے بارے میں بھی گہری معرفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جسے ہم ایک بدیہی قاعدہ سے سمجھانا چاہتے ہیں اور بدیہی وہ ہوتا ہے جسے ہر عام وخاص سمجھے اور بلا دلیل یقین کرے۔ وہ یہ کہ دعوت وتبلیغ کے بارے میں علماء کی اور عوام کی بھی چند قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: یہ کہ اس کام کو صرف ذہنی طور پر اچھا سمجھیں۔ چاہے ملفوظات پڑھ کر، تقاریر سن کر، دعوتی حیرت انگیز کارنامے کو دیکھ کر۔ لیکن عملی طور پر اسے انجام دینے کی نوبت نہ آئی ہو یا انجام دہی بدرجہ کالعدم ہو۔

دوسری قسم: یہ کہ عملی طور پر اختیار بھی کیا ہو لیکن صرف سطحی اور رواجی طور پر، حقیقی طور پر نہیں، یعنی نہ گہری فکر سے نہ اخلاص سے۔

تیسری قسم: گہری فکر اور کامل اخلاص سے اختیار کیا ہو لیکن اپنی سادہ فطرت کی وجہ سے دعوت کی حقیقت اور اس کی اصلیت کو وہ بھی پورے طور سے سمجھ نہ پائے ہوں۔ یہ تین قسمیں وہ ہیں جنہوں نے دعوت کی حقیقت کو پایا ہی نہیں جن کی تعداد شمار کی جائے تو تقریباً پوری دنیا کی دو ثلث مقدار حاصل ہو۔ اب اگر کوئی مسئلہ دعوت کا لیں تو اکثریت کس کی ہوگی وہ آپ سمجھ لیں۔

چوتھی قسم: دعوت کو اس انداز سے سمجھیں ہوں جیسا اس کا تقاضہ ہے حتی کہ اس کی حقیقت واصلیت کو بھی پالیا ہو۔ اس آخری قسم میں جس طرح دعوت کے اکابر جنہیں مرکز کے اکابر کہا جاتا ہے اور کہا جاتا تھا وہ سب ہی داخل ہیں اس طرح دنیا بھر کے وہ اشخاص ''عوام وعلماء'' بھی داخل ہیں جو اس صفت کے حامل ہوں۔

لیکن پھر اس آخری قسم کی بھی دو قسمیں ہیں، اس کو سمجھانے کے لئے عربی ادب کے ایک جملہ کا سہارا لیں گے وہ ہے ''مَشْرُوْب بِالشَّيْئِ'' جو کسی شئ کے انتہائی ذوق پر دال ہے بلکہ فطرت ثانیہ پر دال ہے یعنی بعض انسانوں کے لیے کچھ کام ان کی فطرت کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ مثلاً خطابت و کتابت، نعت وقراءت، تصنیف و تالیف نظام و اہتمام، مناظرہ و مباحثہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ اسی طرح دنیوی امور میں جس کی وجہ سے وہ اپنے اپنے میدان میں ایسی ایسی باتیں بولتے لکھتے اور اپناتے ہیں جو ہزاروں انسانوں میں انہیں ممتاز کر دیتی ہیں۔ یہ اس فطری مزاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی وہ بدیہی قاعدہ ہے جس کا اشارہ ہم نے چند سطور پہلے کیا تھا۔ یہ اہل فطرت اپنے اپنے میدان میں بے مثال کارنامے انجام دیتے ہیں اور دنیا ان کے کارناموں کو تسلیم کر کے کھلے دل سے ''خوش آمدید'' کہہ کر ان کا استقبال کرتی ہے۔

(⬅) ہماری یہی بات کو بہت بڑے عالم ''شاہ ولی اللہؒ'' نے بھی بیان کی ہے تعبیر کا فرق ہے ہم نے فطرت کو مشروب بالشی سے اور حضرت شاہ صاحب نے ''وجدان و ذوق'' سے تعبیر فرمایا ہے ہم اس سے تائید چاہتے ہیں۔ حضرت نے اسے سمجھانے ایک حسی مثال دی ہے تاکہ دنیا کی مثال سے دین میں وجدان کو سمجھا جا سکے فرمایا ''جس طرح ہر انسان بھوک و پیاس اور ادویہ کی سرد و گرم تاثیر کو بلا دلیل جانتا اور سمجھتا ہے، وہ جس سے اسے جانتا ہے وہ خارجی کسی دلیل سے نہیں بلکہ اس کے اندر کے ''وجدان'' سے جانتا ہے جس کو ''ذوق سلیم'' بھی کہتے ہیں۔ دینی راہ نما ''اصلاح کے طریقے'' وجدان سے جانتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ''وجدانیات'' کے صحیح ہونے کا طریقہ بتلایا ہے۔ فرمایا کہ وجدان کو ذوق اور وجدانِ صحیح کو ذوق سلیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم حقانی کے دل میں بدیہی علم (جو دلیل کا محتاج نہ ہو) پیدا فرما دیتے ہیں کہ اس نے جو باتیں سمجھی اور جانی ہیں وہ برحق ہیں اور مطابق واقعہ ہیں۔

"... ولا بالحِس، بَلْ هِيَ أُمورٌ لَا يكشِفُ عَن حقِيقتِها اِلا الوجدانُ ...
لاطريقَ اِليها اِلّا الذوق السليم ... انما يكونُ بخلقِ اللهِ عِلْمًا ضروريًّا فِيه ..."
(رحمۃ اللہ الواسعہ ۲/۱۳) جس طرح دیکھنے والا جب کوئی چیز دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں مرئی کا علم پیدا فرمادیتے ہیں اسے دیکھی ہوئی چیز کا یقین ہوجاتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالعزیز دباغؒ کو صحیح وسقیم حدیث کی جو پرکھ ہوجاتی تھی وہ اسی وجدانی علم سے۔

چناں چہ اصول حدیث میں حدیث معلل کی پرکھ کے لیے کسی قاعدہ کی نفی اور دعویٰ کے دلیل کی نفی کرتے ہوئے اسی وجدان وذوق کو معیار قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے اس پر کلام کرنے والے قلیل وخاص الخاص محدثین ہی ہوتے ہیں کیوں کہ ذوق ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا "وَلَا يَقومُ بِه اِلَّا مَن رَزقَه اللهُ تعالىٰ ... وَقَد يقصرُ عِبَارةُ المعلِّلِ عَنْ إقامةِ الحُجّةِ عَلىٰ دَعواهُ.. "وَلِهٰذَا لَمْ يتكلمْ فِيهِ اِلّا قليلٌ" ... (نزھۃ النظر صفحہ ۶۵) (➡)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں فرق مدارج کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس بدیہی قاعدہ سے ثابت ہوتا ہے، اب اس کا احتمال تھا کہ اس فرق کو لوگ یا تو ناسمجھی سے یا ناانصافی یعنی خودغرضی سے اختیار نہ کریں اور حق والے کو حق نہ دیں تو حدیث شریف میں آگاہ کردیا۔ "اَنْزِلُوا النَاسَ منازِلَهُمْ" ان دونوں کے مجموعے سے اب ہم کہتے ہیں کہ چوتھی قسم میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب "مشروب بالدعوت" ہیں یہ پہلی قسم ہوئی اور باقی سب "غیر مشروب بالدعوت" یہ دوسری قسم ہوئی اور اگر ناراضگی ہو تو کہیں باقی سب بھی "مشروب بالدعوت" ہیں لیکن ایک قسم وہ جس میں یہ صفت اتم درجہ کی ہو اور دوسری قسم وہ جن میں اتم درجہ کی نہ ہو ان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب میں یہ صفت اتم درجہ کی ہے۔

اور دعویٰ مذکور کی دلیل ان سب کے سالہا سالوں سے کیے جارہے اور سنے جارہے

بیانات اور ان کی فکریں ہیں۔ کیوں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بیانات میں ایمان ویقین اور دعوت ہی دعوت ہے اور دیگر حضرات میں دین وشریعت ہے۔ اور ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ دیکھئے صفحہ ۱۹۶ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مدارس کا عظیم مقصد تعلیم ہے اور خانقاہوں کا مقصد تزکیہ ہے اسی طرح دعوت وتبلیغ کا خاص مقصد دعوت ہے اب اگر دعوت کی جدوجہد میں دعوت ہی نہ رہے تو ایسا ہوا کہ ہیں تو مدارس لیکن ان میں تعلیم نہیں پھر طاقت کہاں سے حاصل ہوگی؟ جو حضرات فطرۃً اس قاعدہ پر ہیں وہ ان بیانات میں فرق بھی ضرور سمجھتے ہیں، چاہے اس قاعدہ کی کوئی تفصیل کرے یا نہ کرے اور جو علماء وعوام حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی جانب ہیں اس کی غالب وجہ ایک یہ بھی ہے۔

ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ بدیہی قاعدہ ہے جسے ہر میدان میں ہر کس و ناکس سمجھتا ہے تو یہاں بھی جو حضرات اس کو سمجھتے ہیں وہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ رہیں گے وہ کبھی بھی ان سے جدا نہیں ہوں گے حتی کہ ان کے نزدیک تو حضرت مولانا کی یہی باتیں جو دوسروں کے نزدیک باعث اعتراض ہیں وہ ہی ان کے یہاں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے نہ صرف بلند درجہ پر ہونے کی بلکہ حق پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔ چناں چہ ہم بھی یہاں اپنے ذوق کی بات کہتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب ان باتوں کو کہنے میں کوئی تکلف سے کام نہیں لے رہے ہیں بلکہ یہ باتیں تو ان کی زبان سے بلاتکلف نکل رہی ہیں کیوں کہ وہ مشروب ہیں یعنی باتیں خود مولانا کی زبان سے فطرۃً نکلنے کے لیے اس طرح مجبور و بے قرار ہیں جس طرح جادوگر سجدہ میں گرنے پر مجبور ہو گیے جس کو قرآن نے مجہول کے صیغے سے تعبیر کر کے سمجھایا ہے۔

''وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ'' اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ صداقت سامنے آنے کے بعد وہ اپنے پر قابو نہ رکھ سکیں اور ایمان لانے اور سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس قاعدہ کی اگر دوسری مثال خود لفظ ''شرب'' سے آپ چاہتے ہیں اور وہ بھی قرآن شریف ہی سے تو وہ بھی پیش خدمت ہے۔ ''وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ''، یا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ان باتوں کو حضرت مولانا سے کہلوا رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ ''مشروب بالدعوت'' ہیں اور اتم درجہ میں ہیں۔ اس کو آپ چاہیں تو کہہ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کام کو کھولا ہے جیسا حضرت مولانا محمد الیاسؒ و محمد یوسفؒ پر کھولا تھا۔ بیٹا، باپ کے نقش قدم پر ہوتا اور اس کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ ''اَلْعِرْقُ دَسَّاسٌ''۔

آپ کو شاید اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ جو ''مشروب بالدعوت'' ہو وہ اپنے بڑوں سے پائے ہوئے ورثہ کی نہ پوری طرح حفاظت کرسکتا ہے بلکہ اس کو زمانہ کے تقاضہ کے مطابق اگلی منزل پر بھی لے جاسکتا ہے جس کے لیے کچھ تجدیدی اقدام بھی ضروری ہوگا کیوں کہ اگلی منزل ایک تو دور بھی ہوتی ہے اور بلند بھی۔ اور دوری اور بلندی خود جدت ہے تو وہاں پہنچنے کے لیے بھی تو جدت وندرت چاہیے۔ ہم اس پوری بات کی مثال دیتے ہیں تا کہ شرح صدر ہوجائے۔

مثال ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کہ وہ ''مشروب بالدین والشریعت'' تھے، ہمیشہ ان کو فکر لگی رہتی تھی شریعت ودین کی اور اسے اگلی منزل پر لیجانے کی تو پیش آمدہ مسئلہ میں وہ دین وشریعت کو سوچتے رہتے جس سے وہ دین وشریعت کو درست طور پر پالیتے جس کی وجہ سے وہ جو سوچتے وہی حکم بذریعہ وحی نازل ہوتا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مزاج معلوم تھا تو ان کی سوچ کے مطابق حکم نازل فرماتے جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے ''اِنَّ اللهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهٖ'' (ترمذی ۲/۲۰۹)۔ علماء جانتے ہیں موافقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ۱۷/ ۱۸ ہیں۔ اور شاید فرمان نبوی ''لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِيْ لَكَانَ عُمَرَ بْنَ

الخطاب۔۔ ''(ترمذی ۲/ ۲۰۹)۔کی وجہ یہی ''مشروب بالدین'' ہے۔اب تو سمجھ لیا ہوگا کہ جو جس کا مشروب ہوتا ہے وہ اس پر کھلتا ہے وہ کسی اور پر نہیں کھلتا۔

تو پھر یہ بھی کہنا بجا ہوگا کہ غیر مشروب بالدعوت چاہے جو کوئی ہو اور جتنے بھی ہوں اگر ان کے ساتھ مشروب بالدعوت نہ ہو تو ترقی تو درکنار حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ، ومولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے پایا ہوا ورثہ بھی محفوظ نہ رکھ سکیں نتیجہ یہ ہو کہ یا تو دعوت وتبلیغ ختم ہی ہوجائے یا رہے لیکن بے جان وبے روح ہوکر یا رسمیت وخودغرضی میں ڈھل کر۔آپ چھوٹے بڑے دینی ادارے اور مکاتب قرآنیہ کے منتظمین میں ترقی یا جمود یا انحطاط جو بھی پائیں گے اس کی وجہ اس مذکورہ وصف کی زیادتی یا کمی یا اس کا فقدان پائیں گے ہماری اس بات پر غور فرمائیں کتنی درست یا نا درست ہے! بس اس تفصیل نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو ''أَنزِلُوا النَّاسَ مَنازِلَهُمْ '' کے حقیقی مرتبہ پر کھڑا کردیا اور آپ نے بھی شاید دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

(۷) ہمیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں مثلاً ہندی، اردو، انگریزی اور گجراتی وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں ان زبانوں میں نہ صرف یہ علوم پائے جاتے ہیں بلکہ لوگ بلا پڑھے عرف ومحاورے کی وجہ سے ان کا گاہے گاہے استعمال بھی کرتے ہیں، ان کی بولیوں میں ان کا رنگ وڈھنگ پایا جاتا ہے اور اصحاب ذوق اس کا لطف بھی اٹھاتے ہیں۔اس کا تجربہ ہمیں ہیں آپ بھی اس کا تجربہ کیجیے۔

ان علوم سے مراد وہ بحثیں ہیں جو بلاغت، اصول تفسیر، اصول فقہ، اصول حدیث اور نحو وغیرہ میں ہیں۔مثلاً نحو میں شرط وجزا، حذف وذکر، افعال قلوب، مقاربہ اور مدح وذم۔اور اصول فقہ میں امر ونہی کی اقسام، امر ونہی کا طلب فعل یا ترک فعل کی طلب کے لیے ہونا، حقیقت

ومجاز۔۔۔اوراصول تفسیر میں فہم مخاطب کی رعایت،کلام بطریق تنصیص وکنایہ،تذکیرتبشیروتہدید اور حاضر وغائب ۔۔۔اسی طرح بلاغت میں اسناد،استعارہ،تشبیہ،مبالغہ،کنایہ،مخاطب کے درجات،تاکید مدح بالذم اورعکس اورتخیلات وتوھمات وغیرہ۔۔۔اوراصول حدیث میں جرح وتعدیل اوران کامبیّن ومبہم ہوناوغیرہ۔

ان کااجراءاپنے اپنے انداز میں لوگوں کےمختلف طبقات میں مثلاًعورتوں،جوانوں، بوڑھوں میں پھر بازاروں،مختلف اداروں کےعملہ میں اورمیلوں اورجلسوں میں ہوتا ہوانظرآتا ہے۔اس تفصیل سے ہم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب ایک عام آدمی کےکلام کا حال یہ ہےتوکسی اسٹیج کےخطیب ومقرر کے بیانوں میں ان کی جھلک فراموش نہیں کرنی چاہیے۔لہٰذاکسی خطیب کےکلام سےکوئی بات ایسی سامنے آئےجس سے اس کےظاہری معنی مراد لینے میں کوئی اعتراض ہوتو مذکورہ کلام کے اصولوں پرڈھال کراس کی مرادکومتعین کرنا چاہیےجس سے وہ اعتراض دفع ہوجائے۔یہ بات اس وقت پتھر کی لکیر ہوجب کوئی تقریر کی طرح یہ حال تحریر کا بھی ثابت کردے۔

توآیئے ہم تقریر وبیان کی طرح تحریر کابھی یہی حال بتاتے ہیں،تحریر کافن اپنی ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے بلکہ بعض چیزیں تواس کی انتہائی اہم ہیں مثلاًتصحیف وغیرہ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔آپ کومعلوم ہے کہ قادرالکلام شعراء کی ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے ان کی قدرومنزلت نقدوزر سےکم نہیں،وہ اگرکسی سےخوش ہوتو اسےآسمان تک اٹھالیجائے ورنہ تحت الثری دفن کردے۔ایک شاعرکواپنے بادشاہ سےشکایت تھی وہ اس سے ناراض تھاتو اس کی ہجو (ذم)میں ایک بیت تیارکی۔ شعر

لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِیْ عَلَی بَابِکُمْ　　　كَمَا ضَاعَ عِقْدٌ عَلَى خَالِصَة

خالصہ اس بادشاہ کی بیوی تھی، ترجمہ : میرا شعر تمہارے دروازہ پر اسی طرح ضائع ہوگیا، جس طرح قیمتی ہار خالصہ کے گردن میں (اس کی بدصورتی کی وجہ سے) ضائع ہوگیا۔ اس سے بادشاہ اور اس کی بیوی دونوں کی ہجو کی ہے۔ جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سزا دینے کے لیے اسے طلب کیا، شاعر سمجھ گیا کہ بادشاہ کو ہجو کی خبر ہو چلی ہے، بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے ہماری ہجو کی ہے؟ شاعر نے کہا نہیں تو کہا کہو تو اس نے وہی شعر دوبارہ پڑھا لیکن ''ضاع'' عین کے شوشے کو کاٹ کر ''ء'' پڑھا ''ضاء'' جس کے معنی ہیں روشن ہونا۔ اب بادشاہ اور اس کی بیوی کی مدح اور ثنا ہوگئی۔ اور بادشاہ نے انعام دیا۔ دیکھیے صرف تھوڑے سے شوشے سے کتنا فرق ہوگیا جب صرف اتنے فرق سے مدح وذم یا انعام وسزا کا فرق ہوسکتا ہے تو پورے کلمہ اور پورے جملے سے کتنا فرق ہوسکتا ہے سوچنے کی چیز ہے۔ فتدبر۔ تو کسی کے کلام کی اچھی مراد بتانے میں ان اصولوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

(۸) حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات میں لوگوں کے مراتب سمجھنے میں عام سوچ کے خلاف لکھا ہے کہ بہت سے اخلاف اسلاف سے، تلامذہ اساتذہ سے، مریدین مشائخ سے اور غلام اپنے آقاؤں سے علم ومعرفت اور زہد وتقویٰ میں سبقت وفوقیت لے گیے ہیں، بہت سے آزاد کردہ غلام محدثین ہیں، حتیٰ کہ صحابیت کے درجہ کو چھوڑ کر بہت سے تابعین بھی بعض صحابہ سے مذکورہ چیزوں میں فوقیت لے گیے ہیں۔

چناں چہ اس اصول کی تائید جوامع الکلم کی ایک حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہے ''رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی لَہٗ مِنْ سَامِعٍ'' کہ ایسا بھی ہوتا ہے جسے علم پہنچایا جاتا ہے وہ اس علم کو زیادہ محفوظ رکھتا ہے یعنی سمجھتا ہے سامع اول سے یعنی پہنچانے والے استاذ سے (مشکوۃ ۳۵)

یہ ہم نے خلاصہ بیان کیا ہے۔ ان کے الفاظ حدیث شریف کے اس ٹکڑے ''لَمْ

یُسْرِعْ بِہٖ نَسَبُہٗ ‘‘ کے ماتحت یہ ہیں ’’ اِنَّ اَکْثَرَ عُلَمَاءِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ لَا اَنْسَابَ لَھُمْ یَتَفَخَارُوْنَ بِھَا بَلْ کَثِیْرٌ مِنْ عُلَمَاءِ السَّلَفِ مَوَالٍ وَمَعَ ذٰلِکَ ھُمْ سَادَاتُ الْاُمَّۃِ وَیَنَابِیْعُ الرَّحْمَۃِ ‘‘ ۔(مرقات ۱/ ۲۷۲) اس سے عام سوچ کی تردید ہوگئی اور اس سمجھ کی خطا واضح ہوگئی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تو چھوٹے ہیں اور دیگر اکابرین بڑے اور قدیم ہیں بلکہ بعض تو کہتے ہیں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دیولا کے شاگرد ہیں پھر ان کے مقابلے میں شاگرد کی بات کیسے درست ہے۔غور کریں کہ آج جس میدان میں جو کوئی بڑے رتبے پر ہے وہ اپنے پیر اپنے استاذ سے ایسا بلند ہے کہ لوگ انہیں ان کے پیر سے زیادہ جانتے ہیں اسی طرح ان کے اساتذہ سے ۔معلوم ہوا حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ معاملہ بالکل درست ہے۔

(⬅) اس کے لیے ہم اپنے ذوق کی ایک بات یہ کہیں گے کہ مفعول فضلہ ہونے کے باوجود اپنے عامل پر مقدم ہوجاتا ہے، اتنا ہی نہیں کہ وہ مقدم ہوجاتا ہے بلکہ حصر کا فائدہ بھی دے جاتا ہے۔ ’’ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ‘‘ (➡)

(۹) ہر بڑے آدمی کو اپنے مختلف تجربات واقدامات اور خیالات میں اس بات کا تجربہ حاصل ہے کہ ماضی میں اس کے کتنے ہی تجربات واقدامات غلط تھے جنہیں وہ درست سمجھتا تھا اور وہ اس پر قائم تھا لیکن بعد میں خود اس کے ہی دوسرے تجربہ نے اس کو غلط قرار دیا۔ گویا یہ بھی ایک بدیہی کلیہ ہے۔ جسے یہاں اس مسئلہ میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(⬅) چاہے وہ شخص دینی ہو کہ غیر دینی لیکن کچھ تجربات ضرور غلط ثابت ہوتے ہیں۔ چناں چہ فقہاء یعنی ائمہ مجتہدین وغیرہ نے بھی اپنے اپنے بعض اقوال میں رجوع کیا ہے۔ اور حق پرست مفتیان کرام نے بھی ماضی کے فتاویٰ سے کسی کی پرواہ کیے بغیر رجوع کیا ہے۔ (➡)

(۱۰) یہ کلیہ بھی ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ جس طرح کسی بندۂ خدا کی رعایت میں کتاب وسنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کتاب وسنت کی رعایت میں کسی بندۂ خدا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں تواز ن اور راہ اعتدال اختیار کرنا خاص علم وبصیرت والوں کا کام ہے۔ آخرت کے پل صراط پر سے گزرنے سے پہلے دنیا کے اس پل صراط پر سے گذرنا آسان نہیں۔ ورنہ خود کے ایمان کے لالے پڑ جائیں۔ کیوں کہ توازن کی رعایت کے لیے گہرے علم وحکمت کی اور احتیاط وتیقظ کی ضرورت ہوگی۔ غالباً امام اعظم رحمہ اللہ تعالی کا قول یہاں مفید ہوگا ''اگر کسی میں ۹۹ وجوہ کفر کی ہو اور صرف ایک وجہ ایمان کی ہو تو اسی ایمان کی وجہ ملحوظ رکھی جائے گی۔

(۱۱) ان ہی مذکورہ اصول وامور کی روشنی میں ہم دار العلوم دیوبند کے فتویٰ کو از روئے فتویٰ اسی طرح درست سمجھتے ہیں جس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ان اقوال کو درست سمجھتے ہیں ، نہ فتویٰ کا انکار کرتے ہیں نہ اس کی مخالفت وتغلیط جیسا کہ ہم نے بندہ کی سادہ سمجھ میں لکھا ہے اور نہ مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کو غلط سمجھتے ہیں۔ رہا سوال کہ دونوں (متضاد) کس طرح درست ہو سکتے ہیں؟ جواب: اس کی وضاحت جوابات کے ذیل میں ہوگی۔ اگر ان مذکورہ امور واصول اور دیگر ان اصول کو جو کتابوں میں مذکور ہیں ملحوظ رکھا جائے تو دونوں کو درست کہا جا سکتا ہے۔ ایک باشعور مدرس پوری زندگی میں شب وروز یہی تو کرتب دکھاتا ہے پھر یہاں کیا پریشانی ہے۔ البتہ اتنی بات یہاں واضح ہو جائے کہ فتویٰ کا مدار استفتاء پر ہوتا ہے ''جیسی روح ویسا فرشتہ'' اگر مستفتی غلطی یا خیانت کرے تو فتویٰ بھی اسی پر متضمن ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو تو وہ معذور ہوتا ہے اور گیا ہو پھر بھی سکوت اختیار کرے تو وہ ماخوذ ہوتا ہے۔

(۱۲) ان اصولوں کے باوجود جو شخص پہلے سے ہی نظریاتی لحاظ سے کسی تحریک وعمل سے مثلاً دعوت وتبلیغ سے متفق نہ ہو، یا متفق ہو لیکن اس نزاعی مسئلہ میں اپنی ہی سمجھ اپنی ہی بات کو حرف آخر

سمجھتا ہو باوجودیکہ متنبہ کیا گیا ہے۔'' وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ '' وباوجودیکہ حق سامنے آ گیا ہے اسے سمجھانے کی کوئی راہ نہ ہمارے پاس ہے اور نہ کسی کے پاس، پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ واللہ الموفق۔

مذہب اسلام کی جامعیت وکمالیت

دین اسلام، دیگر مذاہب کے عقلاء و مذہبی راہنماؤں کے وضع کردہ یا سماوی مذہب میں تصحیف کردہ مذہب کی طرح نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تحریف وتصحیف سے سالم سماوی مذہب ہے۔ وہ نہ صرف سماوی مذہب ہے بلکہ وہ تمام کمالات وخوبیوں کا گلدستہ اور ان کا اس طرح جامع ہے جس طرح بحر محیط اپنی چاروں طرف بہنے والی نہروں کو اپنے اندر جذب کرنے میں۔ پھر وہ جامع ہونے کے ساتھ نہ صرف کامل ہے، جس سے ناقصین درجۂ کمال حاصل کرکے کاملین بنتے ہیں۔ بلکہ وہ مکمِّل بھی ہے۔ جس سے کاملین اگلی منزل پر قدم رکھ کر دوسروں کو کامل بنانے کا سہرا باندھ کر وہ مکملین بنتے ہیں۔ علامہ طیبی شافعیؒ نے اس پر بڑی نفیس ابحاث احادیث مبارکہ کی تشریحات میں فرمائی ہیں۔ (طیبی)

مختصر یہ کہ وہ دین ومذہب جس کی وسعت کرۂ ارض کی وسعت سے کہیں زیادہ ہے، اس دین ومذہب نامی شخص نے نہ اپنا کوئی قدم بلاعلم وبلادلیل اٹھایا نہ اس نے اپنا کوئی قدم بلاحکمت بلابصیرت کرۂ ارض کے کسی حصہ پر رکھا۔ اس دین واسلام نامی شخص سے نکلنے والا ہر ہر قول اور ایک ایک عمل نہ صرف علمی دلیلوں پر مشتمل ہے بلکہ حکماء کی ہزاروں حکمتوں اور بصراء کی لاکھوں بصیرتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بھی ہے۔

بھلا جس دین ومذہب کا یہ حال ہو اس میں کسی پر ظلم وتشدد کا تصور کیسے ممکن ہے! میں سمجھتا ہوں وہ نہ صرف ایک معصیت ہے خدا سے بغاوت ہے بلکہ ایک گناہ اور دین سے انحراف

بھی ہے، جسے نہ وہ دین نامی نفیس مزاج لطیف طبیعت شخص برداشت کرسکتا ہے، نہ اس کے کاملین ومکملین عشاق گوارہ کرسکتے ہیں۔ جب اس کا یہ حال ہے تو عقل صرف کیجیے اور سوچیے کہ اس کے اصولوں کی وہ دنیا کیسی ہوگی !! جن اصولوں پر اس کی بنا منحصر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں موجود تمام ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کا ہار بھی بنا کر ان اصولوں کو پہنایا جائے تو اس کے ایک اصول کی بھی قیمت نہ چکے!

ہم یہاں ان ہی اصولوں میں سے موقع کے مناسب صرف ایک اصول کو پیش کرنا چاہتے ہیں تا کہ پیش آمدہ مسئلہ پر مناسب روشنی ڈالی جاسکے جسے آپ ذیل کے عنوان سے سمجھ لیں گے یہی اصول ہماری یہاں غایت ہے اور اس کی جو قیمت بنے لوگ اس کی وہ قیمت چکائیں یہی ہماری چاہت ہے۔ آپ اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

اصول جرح وتعدیل فی الروایہ

علماء حضرات بخوبی واقف ہیں کہ حدیث شریف کی صیانت وحفاظت کے خاطر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے چند اصول مرتب کیے ہیں جس سے رجال حدیث یعنی روات کو از روئے ثقہ وغیر ثقہ پرکھا جاتا ہے، پرکھ کے بعد جس راوی کی کسی امام جرح وتعدیل نے توثیق کی ہو تو اس کی روایت معتبر ومقبول شمار ہوتی ہے ورنہ غیر معتبر اور نامقبول۔

یہاں قابل ذکر اور قارئین کے لیے قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح راوی کے معتبر ہونے کے لیے ضروری یہ ہے کہ اس کے پاس کسی امام جرح وتعدیل کی جانب سے ''تعدیل وتوثیق'' کی سند ہو، اس طرح ہمارا دین یا کہیے ہمارا فن حدیث اس جرح وتعدیل کرنے والے امام ومحدث کو بھی ''اصول'' کا پابند بناتا ہے، اور یہ رہنمائی لوگوں کو دیتا ہے کہ کس محدث اور کس امام کی جرح معتبر ہے اور کس امام کی جرح معتبر نہیں۔ سبحان اللہ کیا شان ہے اسلام کی !! تا کہ کسی

پر ظلم وتشدد نہ ہو" وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا "۔بس انہی اصولوں یعنی شرائط کا ذکر ذیل میں ہے۔

امام میں جرح وتعدیل کی شرائط

پہلی شرط : یہ ہے کہ وہ امام اسباب جرح وتعدیل کو جاننے والا ہو۔لہٰذا اگر ان کے اسباب کو نہ جانتا ہوتو اس کی جرح یا توثیق غیر معتبر ہوگی۔"تُقبلُ التزكيةُ مِنْ عَارِفٍ بِاَسْبابِهَا" (نزهة النظر ۱۱۶)۔

دوسری شرط : یہ ہے کہ وہ عادل وثقہ بھی ہو۔لہٰذا غیر ثقہ کی جرح وتوثیق بھی غیر معتبر ہوگی۔" اِلَّا مِنْ عَدَلٍ" ۔(نزهة النظر ۱۱۷)۔

تیسری شرط : یہ ہے کہ وہ بیدار مغز ہو۔متیقظ ہو۔لہٰذا غیر متیقظ کی جرح معتبر نہ ہوگی۔" مِنْ عَدَلٍ مُتَيقِّظٍ "(نزهة النظر ۱۱۷)۔

یہ آخری شرط بہت ہی اہم ہے۔اس لیے کہ ہر شعبہ کا آدمی اپنا کام تو انجام دیتا ہے لیکن بسا اوقات وہ تیقظ سے انجام نہیں دیتا جس سے لوگ اس شعبہ کی اعلی مسند کی طرف نظر کرتے ہوئے اعتماد کر لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ظلم کے شکار ہو جاتے ہیں اس لیے کسی پر جرح کرنے والے کے لیے اس شرط کا لحاظ نہایت ضروری ہوگا اور اس اصول کو اس کی جو قیمت امانت داری اور عدل وحق کی بنے وہ چکانی ہوگی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان شرائط کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مشہور قاعدہ "وبضدها تتبين الاشياء" کی رعایت کرتے ہوئے ان کی اضداد کو بھی تفریعًا بیان کیا ہے۔لکھا ہے کہ اگر تیقظ سے جرح نہ کی ہو تساھلاً کی ہو تو وہ معتبر نہیں پس راوی مجروح نہ ہوگا۔ پھر انہوں نے ان شرائط کی تائید واہمیت میں اس فن میں کامل دسترس رکھنے والے امام،امام ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو اور امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کے عمل کو بھی بیان کیا ہے آپ حوالے سے مراجعت فرمالیں۔

المختصر ہمیں یہاں جو آپ کی توجہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ تساھل برت کر جرح وتعدیل کرنے والے امام کے جو دو حال بیان کیے ہیں وہ آپ کو سمجھانے ہیں۔ایک یہ کہ وہ امام عدم تیقظ سے کسی ضعیف راوی کی توثیق کردے گا تو وہ اس حدیث کا مصداق بن جائے گا جو مسلم شریف کے مقدمے میں ہے کہ ''جو شخص کسی حدیث کو جھوٹ اعتقاد وخیال کرے پھر بھی وہ اسے دوسروں سے بیان کرے تو وہ خود ایک جھوٹا شخص ہے۔ دوسرا اگر وہ امام ثقہ راوی کی تضعیف کردے (چوں کہ اس سے وہ راوی اس جرح سے تادم حیات عیب دار بن گیا باوجودیکہ وہ ثقہ ہے) تو وہ امام اس راوی پر تہمت لگانے والا ہوگا۔خلاصہ یہ کہ وہ امام خود یا تو شریعت کی نظر میں جھوٹا بن جاتا ہے یا تہمت لگانے والا ۔العیاذ باللہ۔ (نزھۃ النظر ۱۱۸)۔ یہ ہے غفلت سے جرح کرنے کا انجام جسے کہیں لینے کے دینے پڑگیے ۔علماء حضرات تو ان شرعی نزاکتوں کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ۔الحمدللہ۔اس پر عمل بھی فرماتے ہیں۔لیکن جو عوام حضرات ایک دوسرے پر اور ان کے علماء حضرات پر جرح ونقد کرتے ہیں کیا انہیں ان اصول سے ذرہ بھی واقفیت ہے!

مذکورہ شرط'' تیقظ'' محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ۔کے نزدیک کس قدر اہم ہے! کہ اسے'' شیخ اور طالب کے آداب'' کے تحت بھی بیان کیا گیا ہے۔ چناں چہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''مجلس املاء'' میں تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کوئی محدث اپنی اصل کا املاء کرارہا ہو اور مجمع کثیر کی وجہ سے آواز طالبین تک نہ پہنچتی ہو تو آواز پہنچانے والا مقرر کرے لیکن وہ عام آدمی نہ ہو بلکہ وہ بھی متیقظ ہو ''مُسْتَمْلٍ یَقْظٍ ''یہاں بھی اس کی شرط ہے۔(نزھۃ النظر ۱۲۶)۔

جرح میں اسباب تساھل

سوال یہ رہتا تھا کہ کسی امام نے کسی پر عدم تیقظ یعنی تساھل میں جرح یا توثیق کی ہے یہ کیسے معلوم ہو؟ تو قربان جائے علماء محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ پر کہ انہوں نے ہم کو باخبر ہونے کے

لیے اس کے اسباب بھی بیان کر دیے اور ہمیں پتہ دے گیے کہ اگر کسی کی کسی پر جرح درست یا نادرست معلوم کرنا ہو تو اس امام کے اندران اسباب کو دریافت کرو اور پھر تم خود ہی اس کی جرح کا فیصلہ کرو کہ کس حد تک صحیح ہے؟ کیوں کہ اسباب وہ ہوتے ہیں جو ہر کسی کی زندگی سے جھلکتے چھلکتے ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ جس سے اس امام کو ہم سمجھ سکیں۔ ذیل میں ان ہی اسباب کا بیان ہے۔

پہلا سبب : خواہش نفس کی پیروی۔ مثلاً مذہبی عصبیت کی وجہ سے'' وَالاٰفَةُ تَدخُلُ فِي هٰذَا تَارَةً مِنَ الْهَوٰى '' ۔

دوسرا سبب : غرضِ فاسد۔'' هو الغرضُ الفاسدُ '' (نزھۃ النظر ۱۱۸)۔ مثلاً لوگوں کو دوسروں سے دور کر کے اپنی طرف مائل کرنا۔ لکھا ہے کہ متقدمین میں ورع وتدین کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اس سے اکثر صحیح سالم تھے۔ لیکن متأخرین کا حال دیگر ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ علامہ تقی الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کچھ اور بھی اسباب بیان کیے ہیں مثلاً۔

تیسرا سبب : اصحاب تصوف واصحاب علوم ظاہرہ (علوم حقہ وغیر حقہ) کا اختلاف اور ان کا تنافر۔ '' اَلاختِلَافُ بَيْنَ المتصوِّفَةِ وَاَصْحابِ العُلُوْمِ الظَّاهِرَةِ فَوَقَعَ تَنَافُر '' (شرح، نزھۃ النظر ۲۳۹)۔

چوتھا سبب : ورع وتقویٰ کے فقدان سے مذمت پر اتر آنا '' اَلاَخْذُ بِالذمِّ مَعَ عَدمِ الوَرْعِ '' (حوالہ بالا)۔

دیکھیے یہ اصول اس لیے بہ طور ہدایت پیش کیے گیے ہیں کہ تا کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ اس طرح کے اعمال محدثین اور بڑے علماء سے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ جب کہ یہ کئی صدیوں پہلے کا حال ہے، پھر آج کا حال کس قدر قابل قال اور لائق فال ہو سکتا ہے وہ ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے علم میں رکھنے کی خاص وجہ یہ کہ ہم خود بلا کسی مسند جرح ونقد کا کام ہرگز انجام نہ

دیں۔ہم ان اعتراضات کے اوراق مرتب کرنے والوں سے مخاطب ہیں جنہوں نے غلط فہمی عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

نہایت توجہ کے قابل مقام

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد اب ہمیں اہم منزل پر قدم رکھنا ہے، سمجھیے اس سے پہلے کے سارے ہی مباحث اس کی تمہید تھے۔غور و توجہ کی منزل یہ ہے کہ محدثینؒ کی ذکر کردہ تفصیل تو راوی کے صرف ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے متعلق تھی جس سے وہ راوی یا تو نقل روایت کا اہل یا نا اہل ٹھیرتا ہے۔اور یہ چیز یعنی حدیث شریف یا اس کی روایت، دین کا ایک جز ہے، جب اسلام نے دین کے ایک جز کے لیے اتنی احتیاط بتائی اور اس قدر اصول فراہم کیے ہیں تو کسی شخص پر کل دین کے بارے میں یعنی اس کے حق و باطل پر یا حق و ضلالت پر ہونے کے فیصلے کے لیے کس قدر اصول دیے ہوں گے یہ سوچا !! اور کیا یہ دل چسپ بات نہیں کہ کسی پر حق و ضلالت کا فیصلہ لینے کے لیے اس قدر احتیاط و تیقظ کی ضرورت ہوگی کہ دم گھٹنے لگے۔اب ان دونوں مسئلوں کا تقابل کر کے اس کی اہمیت کو آپ اگر سمجھیں تو آپ متیقظ ہو سکتے ہیں۔تو آییے ہم اس پر مختصر روشنی ڈال دیتے ہیں۔

منبع حق ''قرآن'' کا فیصلہ فیصلہ حق کے لیے

گذشتہ تفصیل تو اصول حدیث کی تھی، اب ہم اپنے اصل اور اہم مرجع ''قرآن حکیم'' کی طرف مراجعت کر کے اس سے دریافت کرتے ہیں کہ اے خدا کی کتاب تو بتا کہ کسی پر حق و ضلالت کا فیصلہ لینے کے لیے کیا اوصاف ضروری ہیں اور اس کے کیا اصول ہیں؟ چناں چہ تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ہم صرف اس کی ۴ آیات لیتے ہیں۔

(۱) وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (سورہ نساء ۸)

(۲) يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورہ ص ۲۶)

(۳) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورہ حدید ۲۵)۔

(۴) إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (سورہ نحل ۹۰)

ان میں سے پہلی آیت شریفہ کا خلاصہ ہے کہ ہمیں حکم ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف سے فیصلہ کریں۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو خواہشات کی پیروی سے پوری طرح بچ کرنہیں تو (تم خود ہی) حق سے ہٹ جاگرو گے۔ تیسری کا حاصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ کی تنزیل کا سارا نظام ہی عدل وانصاف کے قیام کے لیے ہوا ہے تو پھر ہر چھوٹی بڑی بات میں اس کا لحاظ رکھو اور چوتھی کا حاصل ہے کہ خود اللہ تعالیٰ امر ہیں کہ عدل کرو (جس طرح اقیموا الصلوٰۃ میں امر ہیں)۔۔۔۔۔

ان میں سے دو میں عدل کا اور ایک میں حق کا اور ایک میں قسط کا ذکر ہے۔ اس میں کون سی چیز ایسی ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے! صرف عدل کو دیکھیے، اگر عدل کی جامعیت کی طرف نظر کرتے ہوئے اسے تحریر کرنے جائیں تو وہ ایک کتابچہ بن جائے۔ تفصیل سے کنارہ کرتے ہوئے صرف توجہ مبذول کرا دیتے ہیں۔ عدل کے ۳ درجات ہیں (۱) خدا کے ساتھ عدل (۲) لوگوں کے ساتھ عدل (۳) خود اپنے ساتھ عدل تینوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرنا۔ ان تینوں کو ملحوظ رکھنے کو عدل کہتے ہیں جس میں سب ہی کچھ سما جاتا ہے۔

اورآیت خطبہ ثانیہ میں ۳صفات ''عدل، احسان اور ایتاء'' کا ۳خرابیوں ''فحشاء، منکر اوربغی'' سے تقابل ہے جوان کا توڑ ہے۔اس طرح کہ

عقل کے تین درجات ہیں۔(جزبرہ۔سفاہت، حکمت)

شہوت کے تین درجات ہیں۔(فجور، جمود، عفت)

غضب کے تین درجات ہیں۔(تہور۔جبن، شجاعت)

اور یہی تین برائیاں ''عقل، شہوت اور غضب'' تمام گناہوں کی جڑ ہیں جن سے نو اقسام حاصل ہوتی ہیں۔جن میں افراط کی تین، تفریط کی تین اور اعتدال کی تین صلاحیتیں ہیں۔ ان تینوں کے توڑ کے لیے عدل کولایا گیا ہے۔کیوں کہ نو حاصل اقسام کا معجون مرکب ۳صفات یا ۳صلاحیتیں ہیں حکمت، عفت اور شجاعت پھران کے مجموعہ سے عدل وعدالت بنتا ہے۔(نہج الائمہ فی اصلاح الامہ حصہ ۴ ص ۳۳ ۱از فیض ابرار ۶/۴ اور از مفاتیح الغیب امام رازی)۔اس سے سمجھنا چاہیے کہ جس عدل وحق کے ساتھ فیصلہ لینے کا حکم ہے وہ کس قدر جامع شریعت ہے۔خلاصہ یہ کہ ہمیں جو بھی کسی پر کوئی فیصلہ لینا ہوتو خواہشات سے اوپر اٹھ کر خالص عدل وحق کی روشنی میں فیصلہ لینا ہوگا ورنہ بہتر ہے معاملہ سے کنارہ کرلینا (واللہ اعلم) یہ ہے اسلام کی وہ جامعیت وکمالیت جواپنے عنوان سے یہاں تک ممتد ہے۔

اب قرآنی ان اصولوں یا ہدایات کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہے کہ کون کس کے حق میں کیا فیصلہ لیتا ہے۔ہم کسی کا نام لینا نہیں چاہتے، کیوں کہ کسی کو مجروح کرنا پوری مدت عمر میں کسی دن بھی یہ کام نہیں کیا جسے ہم پورے تیقظ وامانت داری سے کہتے ہیں پھر اب اور آج کیوں؟ مقصد صرف پیش آمدہ مسئلہ کا شرعی صحیح تجزیہ ہے، نام سے فائدہ کچھ نہیں الٹا نقصان ہوتا ہے، نیز مسئلہ معروف ومعرفت کی حد سے بھی تجاوز کرگیا ہے لہٰذا اس میں ابہام بمنزلۂ بیان کے ہے۔بس

دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پہلے ہمارے اپنے دین وایمان کی حفاظت فرمائیں پھر پوری امت کے دین وایمان کی۔ امین۔

امیر وشوری کی شرعی حیثیت

امیر وشوریٰ ''امارت وشورائی نظام'' کا مسئلہ نہ صرف فقہی مسئلہ ہے بلکہ فقہ سے بڑھ کر ایک اعتقادی مسئلہ ہے اور بہت ہی نازک ہونے کے ساتھ اہمیت کا حامل بھی ہے، اور آج قیل وقال کا زیادہ مدار اسی پر ہے اس لیے ہم اس کی بقدر ضرورت تفصیل پیش کرتے ہیں۔ ''واللہ الموفق''۔

آنے والی تفصیل سے پہلے خلاصہ کے طور پر ہم بتا دیتے ہیں کہ اسلام میں ''نظام امارت'' کے سوا کسی نظام کا نہ تصور ہے نہ کوئی حل'' آپشن'' بس امارت ہی کا نظام ہے۔ یہ اتنا ظاہر وباہر مسئلہ ہے کہ بڑے علماء حضرات کے اعتبار سے تو اسے دلائل سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ امارات کا کوئی بدل، مقابل اور مزاحم ہے ہی نہیں، لیکن علماء کی ایک بڑی تعداد اس اعتقادی مسئلہ میں اپنے گھونسلے کی بنیاد کمزور شاخ پر رکھے ہوئے ہے اس لیے کچھ شرح وبسط سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں شاید حضرت عمر فاروق۔ رضی اللہ عنہ۔ کے عمل سے دھوکہ ہوا ہے چاہے خطاً یا قصداً تو ہم اس دھوکہ اور شبہ کو بھی دور کرنے کے دلائل پیش کریں گے۔ پہلے اس اعتقادی مسئلہ کی تفصیل اور اس کے دلائل۔

شرعاً امیر کا ہونا واجب ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے

مسلمانوں کے لیے ایک امیر وحاکم کا ہونا اتنا اہم ہے کہ علماء متکلمین اس کو واجب فرماتے ہیں، بلکہ اس پر ''اہل السنہ والجماعہ'' کا اجماع بھی بتاتے ہیں، چناں چہ کتب عقائد میں

ہے ” ثُمَّ الْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّ نَصْبَ الْاِمَامِ وَاجِبٌ [1] “۔(شرح عقائد صفحہ ۱۰۹)

اور اس سے بڑھ کر دلچسپ بات یعنی مسلمانوں کی ذمہ داری کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنی ذمے داری سے امیر منتخب کریں انتخاب کی یہ ذمے داری اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ پر ذمہ داری ہونے کی بات شیعہ لوگ کہتے ہیں نہ کہ ہم یعنی امام کو طے کرنا واجب تو ہم دونوں کے نزدیک ہیں لیکن طریقۂ وجوب میں اختلاف ہے ہم وجوب علی الخلق کے قائل ہیں اور وہ وجوب علی اللہ کے قائل ہیں۔ ” وَاِنَّمَا الْخِلَافُ فِیْ اَنَّهٗ یَجِبُ عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی اَوْ عَلَی الْخَلْقِ “(شرح عقائد ۱۰۹، ۱۱۰) لہٰذا اب تو عوام کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس اعتقادی مسئلہ سے اور اپنے پر عائد ذمہ داری سے اوّلاً تو واقف ہوں اور پھر اس پر قائم ہوں، نہ یہ کہ اس بارے میں کسی پر اعتماد کریں اور عقیدت ومحبت کے شکار ہوکر ” خَرُّوْا صُمًّا وَّعُمْیَانًا “ کے مصداق بنیں اور عمل کو ترک کریں۔

---

[1] علماء حضرات جانتے ہیں کہ حنفی اصول میں اجماع کے چند مراتب ہیں۔ مثلاً تمام صحابہؓ کا اجماع، بعض صحابہؓ کا اجماع، مابعد صحابہؓ کا اجماع پھر ایک اور اجماع۔ ان سب میں قوی اجماع صرف پہلا ہے۔ اور یہاں وہی اجماع مراد ہے، اس کے منکر کا حکم بیان کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے آپ ہی حوالے پر ملاحظہ فرماویں (نبراس ۳۳۸)۔ نیز یہ بھی جان رکھیے کہ اگرچہ اجماع ناسخ نہیں ہے۔ جیسے کہ علامہ ابن حجر۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے لکھا ہے ” وَاَمَّا الْاِجْمَاعُ فَلَیْسَ بِنَاسِخٍ “(نزھۃ النظر ۵۱)۔ لیکن ملا علی قاری حنفی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے یہ کہا ہے کہ جو اجماع کتاب وسنت پر مستند ہو وہ کتاب وسنت سے اقوی (حجت) ہے۔ دلیل یہ پیش کی ہے کہ کتاب وسنت کے الفاظ میں تو دوسرے معانی کا احتمال ہوتا ہے، نیز اس میں تقدم وتاخر اور تعمیم وتخصیص کے احتمالات جاری ہوتے ہیں اور اجماع ان سب سے محفوظ ہوتا ہے۔ (شرح قاری نزھۃ النظر ۱۰۴)۔ امیر ہونا ایک تو اجمائی مسئلہ پھر جس اجماع کا یہ حال ہو پھر یہ کتنی مضبوط بات ہوئی!!۔

واجب کی ایک دلیل علماء۔رحمہم اللہ تعالیٰ۔نے اجماع کی دی۔اب دوسری دلیل بھی دیکھیے۔حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام۔رضی اللہ عنہم اجمعین۔نے سب سے مقدم اور اہم ذمہ داری امام کو طے کرنا سمجھا۔حتی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی تجہیز وتدفین پر بھی مقدم اسی کو کیا اور جب تک حضرت ابوبکر۔رضی اللہ عنہ۔خلیفہ طے نہیں ہو گیے تدفین کو عمل میں نہیں لائے۔نیز دوسرے بھی سنگین حالات تھے مثلاً لوگوں کا مرتد ہوجانا وغیرہ۔۔۔لیکن سب نے اسی کو مقدم کیا۔ اور یہی حال ہر خلیفہ کے انتقال پر بھی ہوا کہ جب تک دوسرا خلیفہ طے نہیں ہوا سارے کام مؤخر کیے۔''وَلانَّ الاُمَّةَ قَدْ جعَلُوا اَهمَّ الْمُهِمَّاتِ بعد وَفاتِ النبیِ ﷺ نصبَ اِلامامِ حَتّٰی قَدَّموهُ علی الدَّفنِ''۔۔۔(شرح عقائد ۱۱۰)۔یہ ہے واجب کی دلیل کیا اب بھی کوئی شبہ کرنا درست ہوگا!! ذکر کردہ مسئلہ کے واجب ہونے کو علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب ''ہماری ملی ذمہ داریاں'' میں بیان کیا ہے۔اور شورائی نظام والوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ جس امام وامیر کا واجب ہونا ثابت ہوا شرعاً اس کا ایک ہونا بھی ضروری ہے متعدد امام درست نہیں چناں چہ اسے ذیل کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیں۔

پھر مسلمانوں کے امیر کا صرف ایک ہونا بھی ضروری ہے

مسلمانوں کے نظام کے لیے جہاں امیر ہونا واجب ہے وہاں اس کا ''بدلیل اجماع ''ایک ہونا بھی ضروری ہے۔متعدد امیروں کا ہونا باطل ہے۔لہٰذا متعدد امام وامیر کو ماننا اور اس پر عمل اختیار کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اور اجماع کے بھی خلاف ہے۔

دلیل اس کی امام قرطبی۔رحمہ اللہ تعالیٰ۔نے مہاجرین وانصار کے درمیان اپنے اپنے ایک ایک امیر کے نظریہ کی تردید میں حضرات شیخین کے طرز عمل کو جو پیش کیا ہے وہ ہے، کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے دونوں جماعتوں کو حدیث سے استدلال کر کے اپنے خیال سے

روکا تو تمام نے اپنے قول سے رجوع کرلیا اور سب ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مجتمع ہوگیے۔'' فَرَجَعُوْا وَاَطَاعُوْا '' (الجامع لاحکام القرآن ۱/ ۲۶۴)۔اور کتب عقائد میں اس شبہ کا بھی ازالہ کردیا کہ چلیے شوری نہیں امیر ہی سہی لیکن دو علاقے کے الگ الگ دو امیر تسلیم کیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ تو اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی اور فرمایا ایسا درست نہیں۔ ''فَاِنْ قِيْلَ لِمَ لَا يَجُوْزُ الِاكْتِفَاءُ بِذِيْ شَوْكَةٍ فِيْ كُلِّ نَاحِيَةٍ وَمِنْ اَيْنَ يَجِبُ نَصْبُ مَنْ لَّهُ الرِّيَاسَةُ الْعَامَّةُ قُلْنَا لِاَنَّهٗ يُؤَدِّيْ اِلٰى مُنَازَعَاتٍ وَّمُخَاصَمَاتٍ مُفْضِيَةٍ اِلٰى اخْتِلَالِ اَمْرِ الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا '' (شرح عقائد ۱۱۰)۔

بلکہ بڑے ڈرنے کی بات تو سنن ابی داؤد کی حدیث نے پیش کی ہے۔اللہ اکبر۔ حدیث شریف میں ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں نئی نئی باتیں پیش آئیں گی۔یہ جملہ آپ نے ۳ بار فرمایا۔لہٰذا جو کوئی مسلمانوں کے درمیان باوجودیکہ وہ (ایک امیر پر) مجتمع ہوں تفریق ڈالے تو اسے قتل کردو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔یعنی یہ نہ دیکھو کہ کتنے بڑے رتبہ کا آدمی ہے'' (سنن ابی داؤد جز ۴/ ۲۴۲)۔کتنی بڑی بات ہے!! کسی پر انگلی اٹھانا تو گناہ ہے، لیکن ہم جس دین اور قرآن وحدیث کو مانتے ہیں اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر یہ الزام دیتے ہیں کہ قرآن وسنت کے خلاف باتیں کرتے ہیں تو یہاں ارباب شوریٰ حضرات کو باطنی اور شرعی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ جس شورائی نظام کے وہ علمبردار ہیں کیا یہ دینی تعلیمات وہدایت کے موافق ہے کہ مخالف۔۔۔۔

زبردستی امیر بننے والے کی بھی اطاعت ضروری ہے

اسلام میں اجتماعیت کو برقرار رکھنے کا اتنا اہتمام ہے کہ اگر اجتماعیت مٹنے کے اندیشے سے اور افتراق سے بچنے کے خیال سے بالفرض کوئی شخص مسلمانوں کا زبردستی بھی امیر بن کر اس کا

دعویٰ کرے کہ میں مسلمانوں کا امیر ہوں تو اس کی بھی اطاعت کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ اللہ اکبر۔ کس قدر اسلام کے اصول ہیں !!! اسلام نے اس کو تو نظر انداز کر دیا کہ ایک شخص بغلبۂ زور امیر بن جائے، لیکن مسلمانوں کی اجتماعیت میں پھوٹ وٹوٹن کو نظر انداز نہیں کیا۔ حالاں کہ اسلام اس کو بھی جانتا ہے کہ جو شخص بزور بازو امیر بنے گا تو کچھ لوگ تو اس کے مخالف یقیناً ہوں گے تو افتراق تو اس صورت میں بھی ہے لیکن اس کی پرواہ اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ امیر بن کر اس شر وفساد کا خاتمہ کر سکتا ہے جس کے لیے ضرورت پڑے تو وہ مخالفت کرنے والے کو قتل بھی کر سکتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے۔ تو پھر افتراق کو دور کر کے اجتماعیت کو بچایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم وہ روایت درج ذیل ہے۔

حدیث شریف میں ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور امیر کی بات کو سننے اور ماننے کی چاہے تم پر کوئی غلام زبردستی ہی کیوں امیر نہ بن جائے۔ '' أُوْصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ ، وَالسَّمعَ وَالطَّاعَةَ وَإِن تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ '' (سنن کبریٰ للبیہقی ۱۰/ ۱۹۵)۔ اور یہی بات آگے امام غزالیؒ کے حوالے سے آ رہی ہے۔

(⬅) اور سنن دارمی کی روایت میں اسی اجتماعیت کی اہمیت کو امارت سے جوڑ کر نہ صرف امارت کو ضروری قرار دیا ہے بلکہ امیر کی اطاعت کو لازم بھی قرار دیا ہے '' عن تميم الداری انه لا اسلام الّا بجماعةٍ ولا جماعة الا بامارةٍ ولا امارة الا بطاعةٍ ۔۔۔'' (دارمی ج ۱/ ۶۹ باب فی ذهاب العلم) یعنی اگر تم اسلام کا وجود چاہتے ہو تو جماعت (اجتماعیت) ضروری اور اجتماعیت چاہتے ہو تو امیر ضروری اور امیر چاہتے ہو تو اطاعت امیر ضروری۔ اس کی بین مثال نماز کی جماعت ہے اور اس کا امام اور اس کی اطاعت ہے۔ جب نماز

کی مثال ہمارے سامنے ہے پھر امارت کیوں سمجھ نہیں آتی۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے ''تلزمُ جماعۃَ المسلمین وامامَھم '' (بخاری شریف ج ۲/۱۰۴۹، مسلم شریف ۲/۱۲۷)۔ اور صحیح مسلم میں ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے ''مَن مَاتَ وَلَمْ یَعْرِف امام زمانِہٖ فقد مَات مِیتۃً جَاھِلِیۃً '' (نبراس صفحہ ۳۱۰ عن صحیح مسلم) اور ایک روایت کے الفاظ ہیں ''لا اسلامَ اِلَّا بجماعۃٍ ولا جماعۃَ اِلَّا بامارۃٍ ولا اِمارۃَ اِلَّا بطاعۃٍ مَنِ استطاعَ مِّنکُمْ اَن لَایَنَامَ نَوْمًا وَلَایُصبحَ صبحًا اِلَّا وَعَلَیہِ اِمَامٌ فَلْیَفْعَلْ '' (ابن عساکر عن ابی سعید۔۔۔) اور حیاۃ الصحابہ حصہ دوم میں امارۃ اور اس کی اطاعت وحقوق کے متعلق کتب حدیث سے ۱۱۰ صفحات پر مشتمل احادیث واثار وغیرہ جمع کیے ہیں۔ اور ایک حدیث میں امارت کو ''الھرج'' سے بہتر قرار دیا ہے اس کا معنی ہے افراتفری، ہنگامہ آرائی، بغاوت اور قتل وغارت گیری وغیرہ ''اَلاِمارَۃُ خیرٌ مِنَ الھَرجِ قِیْلَ۔۔۔'' کہاں تک اس کے شواہد بیان کیے جائیں آپ سوچیے قیامت کے روز جب لوگوں کو بلایا جائے گا تو اس وقت بھی ان کو ان کے اماموں کے ساتھ ہی بلایا جائے گا تنہا قوم کی کوئی حیثیت نہیں ''یَوْمَ نَدعُو کُلَّ اناسٍ بِاَمَامِھِم '' (پ ۱۵) قطع نظر یہاں امام کی مراد سے۔ اور کراماً کاتبین میں بھی دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے پر امیر ہوتا ہے۔ اتنے سارے امارت پر شواہد کے بعد امارت کا انکار جاہل ہی کرسکتا ہے۔ (←)

اس کے علاوہ امیر کی اور اس کی اطاعت کی اہمیت تو قرآن وحدیث میں دسیوں جگہ ہے، جسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، حتی کہ حدیث شریف میں سفر میں بھی امیر بنانے کا حکم ہے اور اسی وجہ سے دعوت وتبلیغ میں نہ صرف سفر میں بلکہ مشورہ میں اور گشتوں میں اور کم وبیش وقت راہ خدا میں نکلنے والوں میں وغیرہ، قدم قدم پر اس حدیث پر عمل کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پورے زمانہ تبلیغ میں بھی تین مشہور ومعروف امیر دنیا نے تسلیم کیے ہیں۔گویا خدا نے جب حالات سازگار تھے اسی وقت سے امیر کی امارت کا بیج ڈلوادیا گویا نمونہ قائم کردیا آنے والے زمانہ کے لیے کہ جب حالات ناموافق ہوں تو کون کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ بس یہی زمانہ آزمائش کا ہے! رہا مسئلہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی امارت کا تو قابل وثوق ذرائع سے ظاہر ہے کہ وہ ہی اس وقت امیر ہیں۔اور ان کے امیر ہونے میں بالکل وہی صورت حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائی سے پیش آئی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے شوری بنا کر حضرت عثمان کی خلافت کے لیے اختیار کی گئی تھی۔وہ ازخود امیر بنے نہیں ہیں بلکہ جو شوری بنی تھی ان میں سے تین اکابر اہم تھے اب ان تین میں سے حضرت مولانا بچ گیے ہیں پس ان کا امیر ہونا گذشتہ امیروں کی جانب سے متعین کردہ طریقہ سے ہے۔

(←) ہماری اس امارت کی بحث کو بعض لوگ سمجھ نہ سکیں کیوں کہ انہیں یہ خیال ستا رہا ہوگا کہ ''امارت'' کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن وہ ایک عمومی ''امارت'' حکمراں پر دال مراد ہے اور یہاں ''تبلیغ کی امارت'' کا مسئلہ ہے جو مذکورہ دلائل سے ثابت نہیں ہوتا۔ہم نے یہاں یہ اضافہ انہی کو سمجھانے کے لیے پیش کیا ہے۔یاد رکھیے صاحب شریعت کے اقوال وافعال میں بڑی وسعت وجامعیت ہوتی ہے۔(جوامع الکلم والافعال) اسی لیے مختصر قرآن وحدیث کی تشریحات پر اسلامی بے مثال کتب خانے وجود پائے۔چنانچہ ان کے ایک ایک جملہ اور ٹکڑے کو لے کر محدثین، فقہاء، مفسرین اور اصولین وغیرہ جماعتوں نے باب اور فصل وغیرہ کا عنوان قائم فرما کر اس پر کئی کئی مسائل واحکام مستنبط کیے۔اور پوری شریعت نکال کر پیش کی۔

پہلا جواب: قرآن وحدیث میں ''امارت'' کو عام رکھا گیا ہے اور عموم میں وسعت

ہوتی ہے جسے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر دلیل بنایا جاتا ہے جیسے ہم نے عموم ''ما دون ذلک'' سے تین مسئلے مستنبط کرنے کی مثال علوم اسلامیہ کی وسعت وگرائی کے شواہد میں دی ہے۔ لہٰذا امارت میں بھی اس عموم کو ہر قسم کی امارت پر دلیل بنانا صحیح ہوگا اس مراد کی کوئی نفی نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اس عموم سے علمائے اسلام نے بھی حدیث سے دو قسمیں مستنبط کی ہیں ایک امامت رامارت کبریٰ۔ دوسری امامت رامامت صغری۔ جس طرح لفظ ''ولایت'' کی دو قسم: ایک ولایت کبری رتامہ دوسری والایت صغریٰ رناقصہ۔ دیکھیے (مشکوٰۃ ۶۲ر اواقعہ عثمانؓ) اور اسے ہم نے نہج الائمہ حصہ ۵ میں بھی بیان کیا ہے۔ دوسرا جواب: یہ عمومی امارت نہیں بلکہ اہل تبلیغ کے لیے ہے کہ ان کا ایک امیر ضرور ہو۔ کیوں کہ جب سفر کے شرکاء کے لیے امیر بنانے کی ہدایت ہے تو اتنی بڑی تبلیغ بغیر امیر کے کیسے ہوسکتی ہے۔ لہٰذا امیر تبلیغ کا ہونا ضروری ہے اسے شوریٰ پر موقوف سمجھنا بالکل ہی درست نہیں ہے۔ تیسرا جواب: جیسا کہ احادیث میں اشراف قوم کو اور معاملات کے ذمہ دار کو'' امام کہا ہے اس ناطے ''امام و امیر'' مراد ہے۔ سنن دارمی میں ہے'' وَمَا الائمۃُ قَالَ اَمَا کَانَ لِقومِكَ رُؤساءُ وَاشرافُ یَاْمُرُوْنَہُم فیطیعُونَہُمْ۔۔'' (سنن دارمی ۶۳ر۱)۔(➡)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بنائی شوریٰ کی حقیقت

شاید اس بات کی صراحت کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ۶ افراد پر مشتمل شوری بنائی تھی وہ نہ مستقل ''امیر'' کی حیثیت سے بنائی تھی اور نہ دائمی وقت کے لیے بنائی تھی بلکہ وہ ایک امیر طے کرنے کے لیے تھی وہ بھی تین دن میں۔ لیکن ضرورت اس لیے پیش آرہی ہے کہ اس کو نہ صرف عوام نے بلکہ علماء حضرات نے بھی ضرورت سے زائد اہمیت دی ہے اور اس میں وہ خود بھی غلطی پر ہیں اور دوسروں میں خلاف حقیقت کی تشہیر بھی کررہے ہیں۔ ''ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ'' کی طرح۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آیئے اس شوریٰ کی حقیقت کیا ہے معلوم کرتے ہیں۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرت پر تو مختلف کتابیں ہیں لیکن مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ جس میں قدم رکھدیں پھر دائیں بائیں جھانکنے کی خاص ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت نے بڑے ہی شرح وبسط سے سیرت پر کلام کیا ہے ہم انہیں سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک طویل حدیث بیان کی ہے جس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ٦ افراد کو حکم دیا کہ تم آپس میں مشورہ سے اپنوں میں سے ایک کو امیر طے کرو اور اس کے بعد جو امیر کی مخالفت کرے اس کو قتل کردو۔ ''فَتَشَاوَرُوْا فِي اَمْرِكُمْ وَاَمِّرُوْا عَلَيْكُمْ رَجُلًا مِنْكُمْ فَمَنْ خَالَفَهٗ فَاضْرِبُوْا رَأْسَهٗ '' (ازالۃ الخلفاء مترجم ۴/ ۲۸۲) تھوڑے آگے جا کر یہی جملہ الفاظ کی کچھ تبدیلی سے یہ ہے ''وَتَشَاوَرُوْا فِي اَمْرِكُمْ فَاَمِّرُوْا عَلَيْكُمْ رَجُلًا مِنْكُمْ فَاِنْ خَالَفَكُمْ اَحَدٌ فَاضْرِبُوْا رَاْسَهٗ'' (۲۸۳)۔

یہ تو صاف ظاہر ہوگیا کہ شوریٰ صرف امیر طے کرنے کے لیے تھی نظام کو چلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے امیر طے ہوجانے کے بعد اس کی مخالفت کرنے والے کو قتل کردینے کا بھی حکم فرمایا۔ شورائی نظام کو درست سمجھنے والوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ابھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ پھر اس شوریٰ نے امیر طے کیا یا نہیں اور اگر کیا تو کتنے وقت میں۔ وہ ہم دوسری جگہ سے پیش کردیتے ہیں۔ شرح عقائد میں ٦ افراد کو معاملہ تفویض کرنے کا ذکر ہے چناں چہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کو منتخب کیا۔۔۔ جس سے شوریٰ کا مرتفع ہوجانا قطعی ہے لیکن یہ عمل کتنے دنوں میں ہوا؟ وہ یہاں نہیں ہے لیکن شارح شرح عقائد جامع المعقول والمنقول محقق علوم علامہ محمد عبدالعزیز فرہاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔ فَاخْتَارَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ عثمانَ وَبَايَعَهٗ بَعْدَ ثَلَاثِ لَيَالٍ مِنْ مَوْتِ عُمَرَ رضی الله عنه ۔ (نبراس ۳۰٦)۔

اب تو چاند ہوگیا اور ظاہر ہوکر ثابت بھی ہوگیا کہ کل عید الفطر ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ کا سہارا لے کر شورائی نظام کے برحق ہونے کا دعویٰ کرے اور اب بھی وہ رمضان سمجھ کر روزہ رکھنے کو عبادت تصور کرے تو اس کی قطعاً اجازت نہیں یہ عبادت نہیں یہ اپنی نفسانیت ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کیوں کہ قرآن وحدیث اور سیرت میں اس ایک واقعہ کے سوا کسی بھی جگہ شورائی نظام کا سراغ ''فی علمنا'' نہیں ملتا۔ اگر قارئین حضرات کو کوئی سراغ ملے تو ہمیں مطلع فرمادیں۔ لیکن یاد رہے کہ آپ آیت شریفہ ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' اور ''وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ'' کو پیش فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں کہ یہ آیات خارج از مبحث ہیں۔ کیوں کہ ان میں اس شورائی نظام کی کوئی تعلیم ہے ہی نہیں جس معنی میں آج لوگ سمجھے ہیں۔ ہم اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

لہٰذا ہم ادباً گزارش کرتے ہیں آج جس معنی میں دعوت کے اکابر حضرات۔ دامت برکاتہم العالیہ۔ کی جانب سے ''عالمی شوریٰ'' کے نام سے نظام چلایا جارہا ہے یہ کوئی محقق بات نہیں۔ کیوں کہ اگر ارباب شوریٰ حضرات یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی بنائی شوریٰ کے تمام حضرات بمنزلہ امیر واحد کے ہیں لہٰذا اس کی گنجائش ہے تو یہ بھی گنجائش کی حد میں نہیں ہے کیوں کہ کتابوں میں اس کی بھی تردید موجود ہے۔ مجھے معاف فرمادیں مجھے کسی کے پیچھے پڑنے کا کوئی جذبہ ہے نہ شوق وعادت لیکن جو حق ہے اس کے کہنے کی ایک بیماری ہے یہ اظہار حق کی ایک ذمے داری اور امانت ہے۔ چناں چہ لکھا ہے۔ ''وَتَرَكَ الْخِلَافَةَ شُوْرٰى بَيْنَ سِتَّةٍ ... بِاَنْ يَخْتَارُوْا اَصْلَحَهُمْ لِلْخِلَافَةِ وَلَمْ يَقْصِدْ اَنْ يَكُوْنَ كُلُّهُمْ خُلَفَاءَ يَتَشَاوَرُوْنَ فِي الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ تَعَدُّدَ الْخُلَفَاءِ بَاطِلٌ'' (شرح عقائد ۱۱۴ از نبراس ۳۰۵)۔

اس جگہ شورائی نظام کے لوگ شرح عقائد کی صرف ایک عبارت سے استدلال کر سکتے ہیں جو ۱۱۳ پر ہے۔ جس میں اعتراض کے بعد بذریعہ جواب یہ مقصد حاصل کیا ہے کہ ''پوری

شوری بمنزلہ امام واحد کہ ہے'' وَاَمَّا فِی الشُّورٰی فَالْکُلُّ بِمَنْزِلَۃِ اِمَامٍ وَّاحِدٍ '' (شرح عقائد ۱۱۳، ۱۱۴) کہ ہماری شوریٰ بھی امام واحد کے درجہ میں ہے۔لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے کیوں کہ محشین اور شارحین نے نفس اس اعتراض وجواب ہی کو بے بنیاد بتایا ہے۔ کیوں کہ یہ شوریٰ بنانا ''مجلس عاملہ کے درجہ میں نہیں تھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔اوراس عرصہ میں بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو امام'' مقرر کیا تھا (جواہر الفرائد شرح عقائد ۶۶۹) اور لکھا ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بحوالہ ابن سعد روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے وفات سے کچھ پہلے ابوطلحہ انصاریؓ کو بلایا اور فرمایا کہ پچاس انصار صحابہ کو لے کر اس گھر کے دروازہ پر کھڑے ہوجاؤ جہاں یہ ۶ حضرات جمع ہیں ، اندر کسی کو بھی جانے مت دینا اور تین دن سے زیادہ مہلت بھی مت دینا یعنی تین دن کے اندر امیر طے ہوجائے۔تو اب شارح کا اعتراض وجواب کا تانا بانا ہی درست نہیں، جس پر شوریٰ والوں کا استدلال موقوف تھا۔ (نبراس ۳۰۵، ۳۰۶)۔

خلاصہ یہ کہ پوری شوری کو ایک امام کے درجہ میں مان کر کام چلانا بھی درست نہیں لہٰذا ''شورائی نظام'' کی تعمیر جو شبہات پر قائم تھی وہ سخت زلزلہ کا شکار ہوکر منہدم ہوچکی اور ثابت ہوگیا کہ اسلام کا نظریہ صرف ''امارت'' کا ہے (واللہ اعلم)۔

(⬅) اور اگر اہل شوریٰ حضرات کا خیال یہ ہو کہ چلیے شوریٰ نہیں ''امیر / امام'' ہی صحیح، ہم اہل شوریٰ بھی اپنوں میں سے کسی ایک کو امیر منتخب کر لیتے ہیں۔تو یہ دو علاقوں میں دو امیر کی صورت بن گئی یہ بھی درست نہیں اس کی بھی تردید ہوچکی ہے۔ ہم آپ کو بتلادیں کہ شوریٰ کا تذکرہ کسی جگہ نہیں، آیے ہم آپ کو امام غزالیؒ کے پاس لے چلتے ہیں انہوں نے ''امارت'' کی پانچ شرطوں کا ذکر کیا ہے مثلاً مرد ہونا، صاحب ورع، صاحب علم ہونا، اہلیت امارت کا ہونا اور قریشی ہونا۔ پھر لکھا ہے کہ اگر ان صفات کے حامل متعدد افراد پائے جائیں تو ترجیح اس کو ہوگی جس کی جانب لوگوں کی رائے زیادہ ہو (بالکل امامت صغریٰ کی امامت کی طرح) اور جو کوئی ان

اکثر رائے والوں کے فیصلہ کو قبول نہ کرے وہ باغی ہے اسے اطاعت حق کی طرف لانا واجب ہے۔ پھر آگے لکھا ہے کہ اگر کسی میں ورع وعلم کی صفات (شرائط) نہ پائی جائیں (جب کہ وہ امام بن چکا ہے) اور اسے معزول کرنے میں بڑے فتنہ کا اندیشہ ہو تو ہم یہی کہیں گے اس کی امامت درست ہے ''فالامامُ مَن انعقدت له البَیعةُ مِن اَکثرِ الخلقِ وَالمُخالِفُ لِلاَکثرِ باغٍ یجبُ رَدُّہ اِلی الانقیادِ اِلی الحقِ ... فَکَیْفَ لَانَقْضِیْ بِصحۃِ الِامامۃِ عندالحاجۃِ'' (احیاء علوم الدین ۱/۱۲۰)

اس سے ہم تین باتیں بتانا چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ اس میں امام وامیر بنانے کی تعلیم ہے، حتی کہ نہ ماننے والے کو باغی کہا جسے اطاعت امیر کی طرف لانا واجب کہا۔ دوسری یہ کہ اگر معیاری امیر میسر نہ ہو تب بھی غیر معیاری امام سے کام چلایا جائے گا لیکن نہ تو امامت کے منصب کو امام سے خالی وفارغ رکھا جائے گا نہ تو شوریٰ بنا کر کام چلایا جائے گا کہ اگر یہ آپشن ہوتا تو اسے ضرور ذکر فرماتے۔ ولقد صدق من قال:

الطرقُ شتیٰ وطرقُ الحقِ مُفردۃٌ والسّالِکونَ طریقَ الحقِ افرادُ
لایُعرفون ولاتدرٰی مَقاصدُھم فَھمْ علیٰ مَھلٍ یمشونَ قُصادُ

تیسری بات یہ کہ اگر غیر معیاری شخص امیر بن جائے تو معزول نہیں کیا جائے گا جب کہ فتنہ کا اندیشہ ہو۔ یہ وہی بات ہے جس کو ہم نے ابھی ''زبردستی امیر بننے والے کی بھی اطاعت ضروری ہے'' میں بیہقی کی روایت سے بیان کیا ہے۔ (احیاء صفحہ ۸۳/دسویں علامت)

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب لکھتے ہیں کہ اطاعتِ امیر کو اپنے تمام دلائل پر مقدم رکھے اس سے ہی اسلام میں اجتماعیت باقی رہتی ہے آج اپنی سمجھ سے حق کہنے کا جذبہ نہیں رہا، اسی بات پر سارے فتنے مرتب ہو رہے ہیں۔ حق کہنے کا جذبہ ہے مگر حق سمجھنے کا جذبہ نہیں کیوں کہ حق ناحق کے ساتھ مخلوط ہو چکا ہے۔۔۔ دعوت کی محنت میں اس کی بھی استعداد پیدا کی

جاتی ہے کہ حق کو ناحق سے خالص کر دیں اور حق کو تسلیم کر لیں اور حق کے سامنے جھک جائیں۔ کبھی کبھی حمیت اسلامی میں حمیت جاہلیت کی بو آ جاتی ہے (مکاتیب ۱/۱۱۴)

اس کام میں چلنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔۔ پہلی قسم جو دوسروں میں اصلاحی نظام چلانا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم جو کام کو سیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ اپنے دماغ سے سوچ کر چلنے والے ہوتے ہیں وہ کسی کو مقتدا بنا کر نہیں چلتے۔ ان کے یہاں نہ امامت کا مسئلہ اہم ہے نہ مشورہ کی عظمت۔۔۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو نبوی طرز پر جس میں امارت اور مشورہ اور اصول و آداب کی رعایت اور پابندی ہے کے ساتھ چلتے ہیں ان کی طرف اللہ تعالیٰ غیبی اسباب متوجہ فرما دیتے ہیں (مکاتیب ۱/۸۳)

ہمیں آج کل کے معلوماتی وسائل سے ''خلافت و امارت'' کی فرضیت و اہمیت پر تحریر کرنے والے علماء کی ایک فہرست میسر ہوئی جسے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ شورائیت کے شبہ سے نکل کر امارت کی حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔

(۱)	الماوردی۔۔۔۔	(الاحکام السلطانیۃ)
(۲)	ابوالمعالی الجوینی۔۔۔۔	(غیاث الامم)
(۳)	قاضی عیاض۔۔۔۔	(اکمال المعلم)
(۴)	النووی۔۔۔	(شرح مسلم)
(۵)	ابن حزم۔۔۔	(الملل والنحل)
(۶)	ابن حجر العسقلانی۔۔۔	(فتح الباری)
(۷)	ابن حجر الھیثمی۔۔۔	(الصوعق المحرقۃ)

(۸)	ابن خلدون۔۔۔	(المقدمۃ)
(۹)	النسفی۔۔۔۔	(العقائد)
(۱۰)	جمال الدین الغزنوی۔۔۔	(اصول الدین)
(۱۱)	عضد الدین الایجی۔۔۔	(المواقف)
(۱۲)	الشوکانی۔۔۔۔	(السیل الجرار)
(۱۳)	شمس الدین الرملی۔۔۔	(غایۃ البیان)
(۱۴)	الجزیری۔۔۔	(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ)
(۱۵)	طاہر بن عاشور۔۔۔	(اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام)

کیا اب بھی شوریٰ کی تعمیر برقرار رہے گی؟ ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام امارت ہی اصل ہے نہ کہ نظام شورائیت۔۔۔(←)

سخت حیرت کی چیز ہے کہ اس مسئلہ میں ہمارے اکابر حضرات چشم پوشی سے کیوں کام لے رہے ہیں، مان لیا کسی وجہ سے وہ ''مرکز نظام الدین'' نہیں رہ سکیں لیکن اس مسئلہ میں شرعی تعلیمات کو کیسے نظر انداز کررہے ہیں !! ہم یہ بات ان کی مزاحمت میں نہیں کہہ رہے ہیں یہ ہمارے بڑے ہیں ہمیں ان کی قربانیاں معلوم ہیں۔ بلکہ ہم تو صرف ایک شرعی واضح مسئلہ کے خلاف جس شورائی نظام کی بنیاد ڈال کر جو کام کررہے ہیں اس پر حیرت کے اظہار میں کہہ رہے ہیں، کیوں کہ کسی بھی بڑے رتبے والے شخص سے کوئی ایسا امر پیش آوے تو یہ سب ہی کے نزدیک قابل تعجب ہوتا ہے (واللہ خیر حافظا)

ہم پہلے بھی اشارہ دے چکے ہیں اور اب دوبارہ بھی، کہ ہماری کسی بڑی شخصیت سے عقیدت ومحبت، ان سے نسبی تعلق یا ان سے علاقہ اور وطن کا رشتہ ہمارے دینی کسی اہم مسئلہ میں'' ہم سے دینی غلط قدم اٹھوانے کا'' بالفاظ دیگر ''تعاون علی الاثم'' کا ذریعہ اور سبب نہ بنے، اسے سمجھنے کی ذمہ داری ہر مؤمن کی خود اپنی ہے۔ ہمارا دین اتنا کمزور اور سستا نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے نسبی تعلق میں یا عقیدت میں فروخت کردیں یعنی فراموش کردیں یا اس لیے نظر انداز کردیں کہ ہم پر ان کا قدیم وعظیم احسان یاد باؤ ہے'' اَللّٰھُمَّ احفظنَا مِنْ ذلك ''۔

ہمیں ایسے موقع پر ایمانی صفات ''خوف ورجا'' اور اس کے نتائج '' نفع وضرر'' کو صرف خدا سے وابستہ کرکے ''حقیقت دین'' کی پیروی کرنی چاہیے نہ کہ رواجی دین کی، ورنہ اس کا خمیازہ ہمیں ہی اٹھانا ہوگا، (واللہ الموفق)۔ یہی بات حضرت علیؓ کے واقعات سے ملتی ہے لکھا ہے کہ ''کبھی کوئی طاقت ورشخص اپنی طاقت کی وجہ سے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی امید نہ کرسکتا تھا اور کمزور شخص ان کے انصاف سے مایوس نہ ہوتا تھا''۔(ازالۃ الخفاء)۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات

ماقبل کی تمام تفاصیل اور اس کے مباحث ذہن نشین رکھیے ورنہ اشاروں سے آپ پورے طور پر سمجھ نہ سکیں گے اور ہم اختصار کے پیش نظر ایک ایک چیز کو تفصیلاً بیان کرنے سے معذور ہیں۔ زیادہ نہیں تو کم از کم '' دعوت وتبلیغ کی جدوجہد کی نرالی شان۔۔۔ وجوہ اعتراضات۔۔۔ رجال دین کے اقوال اور ان کا قابل تاویل ہونا۔۔۔ علوم اسلامیہ کی وسعت۔۔۔علوم ظاہرہ وباطنہ کے درمیان کی نزاکتیں۔۔۔ان کی پانچ مثالیں۔۔۔اور تمہیدی اموروا صول۔''

تاویلات سے پہلے کچھ ضروری نظائر

(۱) امام رازی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ متکلمین کا قول نقل فرماتے ہیں کہ ''جس نے خدا کی عبادت حصول ثواب کے لیے یا عذاب سے ڈرتے ہوئے کی تو اس کی عبادت ہی صحیح نہیں۔ حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل ضروری ہے ورنہ وہ شخص کافر ہوجائے۔ کیوں کہ یہ نیت خاص لوگوں کے اخلاص کے تو منافی ہے لیکن عام اخلاص کے منافی نہیں ہے۔ پھر وجہ کفر بیان کی اور تاویل کی صورت یہ نکالی کہ اس شخص نے وہ عبادت چاہے خدا کی نیت سے نہیں کی ہے لیکن ثواب وعذاب کی جہت تو ملحوظ ہے جو شریعت میں اعلیٰ درجہ میں نہ سہی لیکن ادنی درجہ میں تو ضرور مطلوب ہے (لہٰذا وہ عبادت اب صحیح ہے) اور اگر یہ مذکورہ تاویل بھی نہ کی جائے تو اس وقت یقیناً وہ عبادت صحیح نہ ہوگی پھر تو وہ شخص کافر ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ مستحق عبادت ہے اور یہ جہت کسی بھی طرح پائی نہیں گئی۔ (مرقات ۱۵۹/۳)۔

(۲) مسئلہ ہے ''ایمان'' کا۔ ایمان دو طرح کا ہے۔ ایک ایمان اجمالی اور دوسرا ہے ایمان تفصیلی۔ اب علماء کے دو جگہ کے قول میں کتنا تضاد ''اختلاف'' ہے وہ دیکھئے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ اجمالی ایمان تفصیلی ایمان سے (درجہ میں) کم نہیں۔ پھر وہ ہی علماء دوسری جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تفصیلی ایمان، اجمالی ایمان سے ازید واکمل ہے۔ بالکل ظاہری تضاد ہے۔ اور اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ لیکن اس تضاد کو انہی علماء نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ یہ دو الگ الگ جگہ کے لحاظ سے دو باتیں کہی ہیں۔ اب غلط ہونے کا شبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ جب نفس ایمان وتصدیق سے متصف ہونے کی جگہ ہو جس سے آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں بری الذمہ ہوجائے تو اس میں دونوں برابر ہیں۔ لیکن اس جگہ کے علاوہ کا مقام ہو تو وہ برابر نہیں کیوں کہ اجمالی میں تصدیق واحد

ہے اور تفصیلی میں بکثرت تصدیقات ہیں۔ اسی بات کی وجہ سے نتیجہ کے طور پر علماء نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک اجمالی ایمان ہر ایک کے حق میں فرض عین ہے اور تفصیلی ایمان فرض کفایہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہی کہ عوام میں اجمالی تصدیق ہوتی ہے اور علماء میں تفصیلی لہٰذا علماء کا مقام عوام سے اس معنی کر بھی بلند ہے۔ (شرح عقائد ۹۳)۔

(۳) صاحب عقائد نسفیہ ۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ نے نبیوں اور رسولوں کے مبعوث کیے جانے کے مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ''ارسال رسل میں حکمت ہے'' انہوں نے ''حکمت ہے'' کہا، جو ایک جامع لفظ ہے۔ کیوں کہ اس کے بارے میں تین قول ہیں ایک واجب ۔ دوسرا ممکن۔ تیسرا ممتنع۔ واجب ہم اہل السنہ (ماتریدیہ) اور معتزلہ دونوں کے نزدیک ہے۔ لیکن وجوب کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے۔ ہم وجوب من اللہ اور وہ وجوب علی اللہ کے قائل ہیں۔ دوسرا قول بعض متکلمین یعنی جمہور اشاعرہ کا ہے۔ اور تیسرا قول براہمہ اور سمنیہ کا ہے۔

فائدہ : غور کیجیے پہلی نظیر میں تاویل کو ضروری بتایا گیا، دوسری میں تاویل سے تضاد کو ختم کیا گیا اور تیسری میں جامع لفظ استعمال فرما کر تمام اقوال کو شامل کیا گیا۔ بس ہم ان تینوں مثالوں سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ کسی مسلمان کا قول اگر بظاہر خلاف شرع محسوس ہو تو اس کی کسی بھی طرح تاویل کر کے اس کو غلط الزام سے بچانا چاہیے۔ جیسا کہ مذکورہ نظائر میں آپ نے دیکھا۔ اور اگر کوئی فیصلہ لینا مجبوری بھی ہو تو ایسی حکمت والے کلمات کو استعمال کرنا چاہیے کہ نہ اس پر کوئی الزام ہو نہ گمراہی کا شبہ۔ کیوں کہ آدمی اعمال ترک کرے یہ ممکن ہے لیکن اعتقاداً وہ مذہب پر حملہ کرے یہ ممکن نہیں۔ '' واللہ الموفق''۔ بس یہی باتیں ملحوظ رکھ کر اب ہم حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات کی تاویلات پیش کرتے ہیں بنظر انصاف اور تیقظ و تعمق سے سمجھنے کی کوشش فرماویں۔

(۱) اعتراض موبائل سے متعلق اقوال کی توجیہ : حضرت مولانا محمد سعد صاحب

نے موبائل سے متعلق جو جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ سب ہی تقویٰ کے لحاظ سے فرمائی ہیں فتویٰ کے لحاظ سے نہیں۔ اس سے نہ تو مسئلہ فقہیہ سے ناواقفیت ہے، نہ اپنی طرف سے شریعت میں کوئی مداخلت ہے اور نہ حضرات علمائے دیوبند سے مزاحمت ہے۔ بلکہ عوام کو اس کی مضرتوں سے بچانے کے لیے ممانعت فرمائی ہے جس میں قصداً شدت وتغلیظ اختیار کی ہے کیوں کہ مسند تقوی اور منصب اصلاح وتربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ چناں چہ شاہ ولی اللہ محدث دھلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے فرمایا ہے'' فَاعَلَم اَنَّ لِکُلِّ فَنٍّ خاصةً، وَلِکُلِ مَوْطِنٍ مُقْتَضًی '' کہ ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱/ ۱۵۸)۔ جس طرح مدارس اور دیگر دنیوی ادارے اپنے عملہ پر پابندی عائد کرتے ہیں تاکہ مقاصد میں خلل واقع نہ ہو۔ لہٰذا تقویٰ وفتویٰ کی جہتوں کو فراموش کرکے دونوں کو ایک ہی سمجھنا منشأ سوال ہے اور دونوں کو علی حدہ تصور کرنا منشأ جواب ہے۔

قرینہ: اس توجیہ کا قرینہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے '' عندی '' فرمایا ہے جس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خود مولانا مسند فتویٰ پر بیٹھتے تو وہی فرماتے جو حضرات علمائے دیوبند نے فرمایا۔ اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جو علماء وعوام حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کے اشاروں پر قربان کردیتے ہیں اس کے باوجود وہ عمل میں ان کے مخالف ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ انتہائی تقویٰ پر مبنی ہے اور سمجھتے ہیں کہ مولانا اس کی ممانعت شرعاً نہیں تہذیباً کررہے ہیں۔

اس توجیہ پر بھی سوالات اٹھ سکتے ہیں مثلاً اگر تقویٰ مراد ہے تو فقہی اصطلاح '' ناجائز وغیرہ '' کیوں استعمال کی ہے۔ اور اجر وثواب کی نفی کیسے درست ہے؟ اور قرآن شریف کی اہانت کیسے؟ تو ان سب کے جوابات ہمارے ماسبق کے مباحث میں موجود ہیں۔ البتہ ایک سوال اہم

ہے۔ وہ ہے علماء سوء کہنا اور یہود ونصاریٰ کی ذہنیت سے متأثر ہونا۔ تو ہم یقیناً کہیں گے کہ یہ علماء حضرات کی شان میں تنقیص اوران کی بے ادبی ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے یہ بات کہی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا نے ایسا کہا ہی نہ ہوگا یا اسلوب کچھ اور ہوگا، اگر کہا ہو تو رجوع کرنا چاہیے بلکہ حضرت کی ذات سے قوی یقین ہے کہ رجوع کر ہی لیا ہوگا۔ لیکن یہ سب بھی نہ ہو تب بھی بات تو بن سکتی ہے، وہ اس طرح کہ یہ جملہ عام حضرات علماء دیوبند کے حق میں نہیں بلکہ دعوت وتبلیغ میں فعال علماء حضرات کے حق میں ہے خصوصاً جو مولانا کے منشا کو اچھی طرح جانتے ہیں پھر بھی اس کا استعمال کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ ضمیر کا مرجع اقرب ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔

تفصیلی توجیہ

اگر مسند تقویٰ کے قول سے تسلی نہیں اور ضد بہ مسند فقہ ہے، تو ناجائز کہنے کی بھی توجیہ ممکن ہے۔

(۱) ناجائز کہنا ''سد ذرائع'' کے طور پر ہے، واقع کے اعتبار سے نہیں، تاکہ لوگوں کو فتویٰ کی آخری حد تک جانے سے روکا جائے۔ جیسے عورتوں کے حق میں مسجد سے اور زیارت قبور سے اور تمام کے حق میں اوانی خمر سے ممانعت۔

(۲) یہ بھی سد ذرائع کے طور پر ہے لیکن اس میں دعوت وتبلیغ کی فطرت اس کی قربانیاں پیش نظر ہیں، ورنہ تو ساری دعوت موبائل پر غالب ہوجائے اور جان ومال اور چلت پھرت کی جو جدوجہد مطلوب ہے وہ مٹ جائے اور وہ بے جان وبے اثر ہوکر رہ جائے۔ اور تبلیغی روزمرہ کی کثیر تعداد پر مشتمل مجلسوں میں سینکڑوں گھنٹیاں نمازوں، بیانوں اور تعلیم میں خلل انداز ہوں۔ (←) موبائل کے بارے میں نہ صرف تبلیغ بلکہ مدارس اور علماء کے حق میں بھی دوراندیشی یہی ہے جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے اختیار کی ہے یعنی آپ ان کے حق میں بھی مضر ہونا دیکھ لیں گے کہ نہ مدارس کی اہمیت رہے گی نہ علماء کی کیوں کہ لوگوں کو موبائل پر علماء سے بھی اچھی طرح اور مدارس سے بھی اچھی طرح

معلومات میسر ہوجاتی ہیں پھر علماء کی کیا ضرورت !(➡)

(۳) ازروئے فتوی تیسرا جواب ناجائز کو''ضد صریح''''جائز'' نہ لیا جائے۔ اگر ضد صریح لیں گے تو خرابی پیش آئے گی۔

اورقرآن وحدیث میں سنت کو فرض اور فرض کو سنت وغیرہ کے معنی میں لینا پایا جاتا ہے۔ جس سے ناجائز مکروہ کے معنی میں ہوکر جواز کے قریب ہوجائے گا پھر تقویٰ اور فتویٰ میں جوڑ بھی پیدا ہوجائے گا۔

ترجیحات

موبائل کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ اشاعت دین کا ذریعہ ہے۔ یہ عام علماء حضرات کا نظریہ ہے۔ دوسرا وہ اشاعت کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا کا نظریہ ہے۔ پہلا نظریہ فتوی ہے یا کہیے کہ فتویٰ کے مطابق ہے۔ دوسرا تقویٰ ہے یا کہیے تقویٰ کے مطابق ہے۔ فتویٰ اور تقویٰ میں تقویٰ راجح ہوتا ہے۔ عام علماء حضرات کے پاس یہی دلیل ہے کہ وہ اشاعت کا ذریعہ ہے۔ جب کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے پاس تقویٰ کے ساتھ وجہ ترجیح بھی ہے اور وہ ہے اس کا حادث واختراعی ہونا''بدعت لغوی'' ہی سہی لیکن ہے بدعت جو زمانہ خیر القرون میں نہیں تھی۔ (⬅) چناں امام غزالیؒ نے بعینہ اسی طرح کی بات'' تالیف کردہ کتابوں'' کے بارے میں کہی ہے۔ انہوں نے علماء آخرت کی گیارہوی علامت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور قلب کی صفائی کی بنا پر اپنے علوم پر اعتماد کرتے ہیں، محض کتابوں کی بنیاد پر یا سننے کی بنیاد پر اپنے علوم کو قابل اعتماد تصور نہیں کرتے۔ کیوں کہ کتابیں تو نئی ایجاد ہے، صحابہؓ واکابر تابعین کے زمانہ میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ۱۲۰ھ کے بعد تالیفات کا آغاز ہوا، ابتداءً لوگ تالیف وتصنیف کے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے اس خیال سے

کہ کہیں لوگ کتابوں پر بھروسہ نہ کربیٹھیں۔اوراسی وجہ سے اولاً حضرت ابوبکرؓ مصحف کی تدوین وترتیب سے انکارکررہے تھے۔ ''وَمِنها آن یکونَ اعتمادُہٗ فی علُومہٖ علی بَصیرَتہٖ وَادرا کہٖ بِصفاءِ قلبہٖ لاَعلَی الصُحفِ وَالکُتبِ۔۔۔'' (احیاء علوم الدین ۱؍۸۴) (➡)

اورتیسری وجہ کہ علماء حضرات بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں خیر کے ساتھ شر کا بھی پہلو ہے اور'' جلب منفعت سے دفع مضرت اولیٰ ہے۔اسی وجہ سے پہلے پہل علماء بھی اس سے تصویر لینے میں متردد تھے اورآج بھی محطاط علماء ویڈیو کے مقابلہ میں آڈیو کوترجیح دیتے ہیں۔ (⬅) چناں چہ آج وہ مساجد جن کی بنیادقرآن وسنت کی تعلیمات پر ہیں وہ بجائے اسلامی تعلیمات کے رخ پر جانے کے موبائل کے رخ پر جاتی نظر آرہی ہیں کیوں کہ موبائل پر ہرکسی کی سنی باتیں مسجدوں میں اپنائی جارہی ہیں جس سے ان سے حاصل معلومات سے مستقبل میں علماء کی قدرومنزلت بھی کم ہوجائے گی۔(➡)

نوٹ : ماقبل میں ہم نے لکھا ہے کہ جب کسی کی کوئی بات خلاف شرع ہوتوقول نہیں وجہ قول اہم ہوتی ہےتو ہم نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی منشااوروجہ پرغورکیاجس سے یہ توجیہات حاصل ہوئیں۔جس طرح اقوال رجال دین میں۔

سوال : بات ٹھیک ہے لیکن مولانانے اس موبائل سے قرآن شریف پڑھنے وغیرہ کی جوتشبیہ پیشاب دانی سے دی ہے وہ'' قول کریہ ''اوربھدی تشبیہ ہے۔جواب بلاغت کے اصول میں دیکھ لیجیےاورقرآن شریف میں بھی غورکرلیجیے اس کا جواب ہے۔دراصل بعض باتیں کراہت پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن وہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں،حقیقت کوواضح کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ مثال یہ ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو بیت اللہ''مسجد''میں بھی خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اوربعضوں کو''بیت الخلاء''میں بھی حاصل ہوجاتی ہے

خلاصہ : یہ کہ علوم ظاہرہ وباطنہ کی بحث اوررجال دین کے اقوال کی وجوہات کوملحوظ رکھ کر جب

مولانا کے قول کی وجہ معلوم کریں گے کہ قائل کس منصب، کس میدان، کس پس منظر میں یہ بات کہہ رہا ہے تو آپ کو سراغ ہاتھ لگ جائے گا اور کوئی بھی خدشہ ذہن میں باقی نہیں رہے گا۔ خلاصہ کے ساتھ لطیفہ یہ بھی اگر اس پوری تفصیل سے بھی جواب سمجھ میں نہ آیا ہو تو آسان طریقہ سے یہ سمجھیے کہ آپ ہمارے گذشتہ مباحث پڑھتے آرہے ہیں ہم نے صفحہ ۹۸ پر لکھا ہے کہ ان اصول وامور کو پڑھے بغیر ہماری جانب سے پیش کردہ توجیہات پڑھنا جائز نہیں۔ اب بتائیے ہم نے یہ ناجائز لکھا اور آپ نے ان کو پڑھے بغیر ہی توجیہات کو پڑھا تو اس ''ناجائز'' کا کیا مطلب؟ اور اس میں جو ممانعت تھی وہ کونسی تھی؟ بس اسی طرح مولانا کی بات سمجھیں۔

تنبیہ : یہ توجیہات تو موبائل سے متعلق اقوال کی تھیں۔ آپ اگر موبائل کے علاوہ اقوال میں جو فقہی اعتبار سے بظاہر متصادم ہیں حل کرنا چاہیں تو انہیں بھی اس مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں خود حل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی بقیہ مسائل میں صرف مختصراً توجیہات پیش کریں گے۔

(۲) اعتراض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں تنقیص ۱؎ : حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے بلانے پر چلے گیے جس سے قوم کے بہت سے افراد گمراہ ہو گیے یہ کہنے پر حضرت موسیٰ کی یعنی نبی کی شان میں تنقیص ہے۔ یہ ہے اعتراض۔

۱؎ یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے تمام اقوال میں سب سے سنگین قول صرف دو ہیں۔ ایک یہی دوسرا ''ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی'' جو اس کے بعد نمبر تین پر مذکور ہے۔ ہم نے ۲۵ دسمبر ۲۰۱۷ء کا بیان بذریعہ ''نیٹ'' سنا تو حضرت نے رجوع فرمالیا ہے۔ تب ان دو مسئلوں میں توجیہات کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو رجوع کا علم نہیں یا ہم ''نیٹ'' کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے تو ایسے معترضین کو سمجھانے کے لیے کہ یہ جملہ سبقت لسانی سے نکلا ہوا ہے اور فقہاء کے یہاں عاقل و بالغ کے قول و فعل کی تاویل کی جاتی ہے، بایں وجوہ توجیہات ذکر کی گئی ہیں۔ ورنہ اس کی بالکل ہی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ''غلط'' کو صحیح بتانا خود ''غلط'' ہے۔ لہٰذا ''ہدایت'' والے مسئلہ میں بھی تاویلات کے ذکر کی وجہ یہ سمجھیں۔

توجیہ نمبر ایک : جب ہم نے اس بیان کی کلپ سنی تو صاف صاف دو باتیں حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے فرمائی ہیں۔ایک بات یہ فرمائی کہ مفسرین نے لکھا ہے۔اس کا مطلب کسی تفسیر کے حوالے سے کہہ رہے ہیں پھر اعتراض کی گنجائش کہاں؟ دوسری بات یہ کہی ہے کہ میں شعور سے اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔جب مولانا پورے اذعان ویقین سے کہہ رہے ہیں، بے شعوری یا سبقت لسانی سے نہیں فرمارہے ہیں تو وہ کسی نبی کی شان میں تنقیص کیسے کریں گے؟ اگر کسی کو ان جملوں سے تنقیص محسوس ہو وہ اس کی سمجھ ہے لیکن قائل تو شعور سے کہہ رہا ہے۔پھر تنقیص کا کوئی محل ہی نہیں۔اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو کسی تفسیر سے معلوم نہیں ہوا تو کسی کی لاعلمی دلیل نہیں ہے۔

توجیہ نمبر دو : بنظر انصاف کہہ رہے ہیں کہ ہمیں تو حضرت کی بات سے نبی کی شان میں کوئی تنقیص سمجھ نہیں آتی۔اس لیے کہ قرآن شریف کا منطوق دیکھیے وہ خود ہی یہ مفہوم دے رہا ہے۔ہم اس کو آسان طریقے سے سمجھاتے ہیں۔"وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى" سے اور "وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى" سے معلوم ہورہا ہے کہ "جو کام جس وقت کرنا نہیں تھا وہ قبل از وقت کیا" پھر "قَالَ قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ" سے معلوم ہورہا ہے کہ ان کے بعد یعنی ان کے نہ رہنے سے قوم گمراہی میں مبتلا ہوئی۔قرآن کے منطوق سے ہی یہ دو باتیں معلوم ہورہی ہے کہ مناجات کے لیے جانا قبل از وقت ہوا نتیجہ یہ کہ جانا نہیں چاہیے تھا۔خلاصہ یہ کہ آیت کا منطوق ہی اعجال کی مذمت پر دال ہے "بذریعہ ہمزۂ استفہام انکاری" اور اگر مذمت پر نہیں تو غیر مطلوب پر تو ضرور دال ہے پھر تنقیص کیسی؟ (واللہ اعلم)۔گو یا مولانا محمد سعد صاحب جو واقعہ ہے اس کی خبر دے رہے ہیں اسی کو لوگ تنقیص کی تعبیر میں ڈھال کر کیچڑ اچھال رہے ہیں!! حضرت یونس علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر چلے گیے جو واقع ہے اسی کو کہنا تنقیص کیسے؟ خصوصاً جب اس طرح کہنے سے لوگوں کو اپنے کاموں پر آگاہ کرنا مقصود ہو اور تقاضہ وقت کے کاموں پر لانا ہو جس کو حکمت وعلم کہتے ہیں۔

توجیہ نمبر تین: وما اعجلك میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے جیسے روح المعانی میں ہے جو اعجال کے غیر مستحسن ہونے پر دال ہے، کوئی کہے کہ نہیں کیوں کہ اس کا سبب و عاقبت ''لترضی '' ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ اس وقت صحیح ہوتا جب اس کے بعد اس اعجال سے کسی بھی قسم کا تعرض نہ ہوتا یہاں تعرض ہے۔ ''قد فتنا'' معلوم ہوا اعجال سے استقرار فی القوم ہی بہتر تھا اور یہی بات حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے کہی ہے۔ (فلا بأس)۔ بلکہ اگر انتہائی تیقظ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہی چاہتے تھے کہ وہ قوم میں رہیں کیوں کہ ''فتنا'' میں نسبت اپنی طرف کی ہے اور من بعدک'' میں غیبوبت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ کیوں کہ من بعدك کے معنی ہیں تمہارے'' قوم سے'' غائب رہنے کے وقت بہر حال موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں حاضری پسندیدہ تھی۔ پھر اعتراض کیسے؟ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر چار: یہ جملہ کسی بھی طرح تنقیص نہیں ہے، کیوں کہ نبی کی دو شان ہوتی ہیں۔ ایک شان ولایت '' تَوَجُّهُ العَبْدِ إلى الحَقِّ سبحانه وتعالیٰ '' اور دوسری شان نبوت ''هُو تَوسُّطٌ بَيْنَ الحقِّ وَالعِبَادِ ''(نبراس ۳۳۶)۔ جب دو شان ہیں تو نبی کے کسی وقت میں دونوں میں سے کسی بھی شان پر ہونے کو بتانا باعث تنقیض کیسے ہوگا؟ دونوں ہی شان اس کی ہیں۔ تنقیص تو یہ ہے کہ جو شان اس کی نہ ہو وہ اس کے لیے ثابت کی جائے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو قوم میں ٹھہرنا نبوت کی شان ہے جو ولایت ''لترضیٰ'' پر فی قولٍ راجح ہے (شرح عقائد ۱۱۹)۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا کا قول نہ صرف صحیح ہے بلکہ بہتر ہے اس کی ضد کے مقابلہ میں۔ دیکھیے اس توجیہ نے تو معترض کے قول و مدعیٰ ہی کو قلب کر دیا۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر پانچ: قرآن کریم کی آیت شریفہ ملاحظہ ہو '' فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ ''اس میں وظیفۂ نبوت ''قوم میں دعوت دینے'' کو مقدم کیا ہے۔ اور ولایت کو

وظیفۂ نبوت کے ختم پر موقوف بھی کیا ہے۔ ان دو وجہوں سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم میں ٹھہرنا اور انہیں دین پر جمانا بہر حال بہتر تھا جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب فرما رہے ہیں۔ ان توجیہات پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ جو بات بہتر ہے اس کے کہے پر اعتراض ہو تو وہ خود ناسمجھی کی بات ہے (واللہ اعلم) نیز ہم اقوال رجال دین کی توجیہات وغیرہ میں بتا چکے ہیں کہ وہاں تو ''انبیاء'' جمع کا صیغہ ہے ان سے معرفت میں آگے بڑھ جانا، یا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انبیاء کی جگہ کھڑا ہونا یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ''عبداللہ بن ثوب'' کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کی شبیہ دیکھنا یہ سب تنقیص نہیں پھر یہاں کیسے؟ بس تھوڑی سی سمجھ سے کام لینا ہے ان شاء اللہ آپ سمجھ لیں گے۔

(۳) اعتراض یہ ہے کہ مولانا فرماتے ہیں ''ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی، مطلب اللہ کے ہاتھ میں نہیں''۔ العیاذ باللہ۔ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ بات نوٹ کیجیے کہ ہم نے جب کلپ سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی بات سنی تو کیا پایا۔

الف : ۵ / ۷ منٹ کی کلپ تھی بس۔

ب : مخلوط آواز کی ایسی گونج تھی جس سے سامع صحیح بات سمجھ نہ سکے۔

ج : کلام غیر مربوط تھا۔

ان تینوں باتوں سے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت سے ناراض کسی شخص نے شاید غلط حرکت کی ہے۔ اور آج اس طرح واقع کے خلاف کسی کی تصویر بتانا، کسی کے کلام میں اسی کی آواز میں تبدیلی کرنا وغیرہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا ہے جس کا تجربہ راقم کو ہے۔ جیسا کہ اسلام کے خلاف شر پسند لوگ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے مسلمانوں کا حلیہ بنا کر کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فتنہ کو ہوا دینے کے لیے یہ کسی کی جانب سے خیانت ہوئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ

انہیں ہدایت عطا فرمائیں۔ یہ شبہ اس لیے ہے کہ حضرت کی بیانات میں ۳ عادتیں معروف ہیں جس کو ہر منصف مزاج محسوس کر سکتا ہے۔

الف : ہر اہم بات کو دو بار کہنا۔

ب : درمیانی رفتار سے صاف صاف آواز میں کہنا۔

ج : ہر اہم بات پر قرآن وسنت اور سیرت سے استشہاد پیش کرنا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام والے مسئلہ کی کلپ سنی تو ان تینوں خرابیوں میں سے ایک بھی نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ بیان کی ایسی بات جس پر یا تو دفع اعتراض موقوف تھا اسی کو ہٹا دیا ہے یا اس پر عدم انشاء اعتراض موقوف تھا اسے ہٹا دیا ہے۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں بلکہ سب ہی کو کہنی چاہیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب ایسی بین خلاف شرع بات کہہ ہی نہیں سکتے ۔نعوذ باللہ۔ پھر تو کفر کا حکم لگ سکتا ہے کیوں کہ آیت قرآنیہ کا انکار ہے۔ اس کی کوئی توجیہ ہوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہیں گے کہ حضرت نے ایسا کہا ہی نہیں اور اگر سبقت لسانی سے یہ بات نکل گئی ہے تو رجوع فرض ہے۔ پھر تو صدفی صد یقین ہے کہ رجوع کر بھی لیا ہوگا۔

ہمیں ان تمام پر سخت حیرت ہے جو مولانا کے اس قول کو لے کر پریشان ہیں۔ کیوں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی کتاب ''مسجد کی آبادی کی محنت '' ان کے بیانات ہی کا مجموعہ ہے اور دعوت کے ساتھیوں میں تو کافی مشہور بھی ہے خود اس میں کیا لکھا ہے آپ ملاحظہ فرمایئے۔

''۔۔۔۔۔۔قدرت اللہ کی ذات میں ہے، اولیاء، انبیاء، فرشتے، جبرئیل سب کے سب محتاج ہیں۔ نبی بھی جس کام کے لیے بھیجے گیے ہیں نا، اس میں وہ بھی محتاج ہیں، مختار نہیں ہیں کہ کسی کو وہ ہدایت دے دیں، کہ نبیوں کو ہدایت کے لیے ہی بھیجا گیا ہے لیکن وہ خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارا زور لگا دیا اپنے چچا ابوطالب پر کہ ان کو ہدایت مل جائے

اور دوسرے چچا حمزہ کے قاتل وحشی، کہ وحشی کو کوئی قتل کردے۔ پر اللہ وحشی کو ہدایت دے رہے ہیں اور ابوطالب بغیر ہدایت دنیا سے جا رہے ہیں (مسجد کی آبادی کی محنت ۲۲)۔ دیکھا آپ نے یہ جملہ ''پر اللہ وحشی کو ہدایت دے رہے ہیں'' اتنی صاف بات ہے پھر بھی یہ کہنا کہ مولانا یہ۔۔۔ کہہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے دل کی کھوٹ کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔ اب تو ضرورت نہیں رہتی کہ توجیہات پیش کی جائیں۔ جیسا کہ گذشتہ حاشیہ میں لکھا ہے پھر بھی اگر مولانا سے یہ جملہ نکل بھی گیا ہے تو پھر ذیل کی تاویل آپ کرلیں۔ ہمیں تو ضرورت ہی نہیں۔

توجیہ نمبر ایک : تفسیر وعقائد دونوں فن میں ''ہدایت'' کے بارے میں بحثیں موجود ہیں جس میں دو موقف ہیں ایک اہل السنہ والجماعہ کا دوسرا معتزلہ کا۔ کتب تفسیر میں معتزلہ کا موقف یہ بیان کیا ہے ''اَلدَّلَالَةُ الْمُوْصِلَةُ اِلَی الْمَطْلُوْبِ'' یعنی ایسی دلالت جو موصل الی المطلوب ہو بالفعل، اور ایصال بالفعل کے لیے وصول بالفعل ضروری ہے۔ اس قول کے مطابق اللہ کے ہادی ہونے کا مطلب یہ ہوا'' گویا'' اللہ تعالیٰ بندہ کو'' ہاتھ پکڑ کر'' منزل پر کھڑا کردے۔ دوسرا موقف ہے ہمارا ''اَلدَّلَالَةُ عَلٰی طَرِیقٍ یُوْصِلُ اِلَی المطلُوْبِ'' (شرح عقائد ۹۶)۔ جس کو اراءة طریق کہتے ہیں یعنی صرف ایسے راستے پر چلا دینا جو منزل تک پہنچا سکے۔ چاہے وصول منزل حاصل ہو کہ نہ ہو۔ یعنی کوئی بھی ضروری نہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہمارا قول معتزلہ کے خلاف ہے۔ اب معتزلہ کے قول کو نفی کی تعبیر سے لیجیے'' اللہ تعالیٰ بندہ کا ہاتھ پکڑ کر منزل پر کھڑا نہیں کریں گے'' مولانا محمد سعد صاحب کا قول بن جائے گا مطلب مولانا یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایسی ہدایت نہیں کہ ہاتھ پکڑ کر نماز وغیرہ پر کھڑا کردیں۔ گویا مولانا مسلک اعتزال کی تردید کرکے مسلک اہل السنہ والجماعہ کی تائید کر رہے ہیں، کیوں کہ'' وبضدھا تتبین الاشیاء '' یہ قول تو لائق تعریف

ہے۔اور اس سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ جو علم کتابوں میں منقوش ہے اور درس میں منحصر ہے وہ عام خطاب میں جھلک بھی رہا ہے اور چھلک بھی رہا ہے۔(واللہ اعلم)۔

اس کی تائید ہم اپنے مطالعہ کے علم سے پیش کر رہے ہیں۔ایک بڑے عالم نے بڑی قیمتی بات لکھی ہے جو انہوں نے خدا کے برعکس شیطان کے بارے میں کہی ہے کہ لوگ اپنے گناہوں کا الزام شیطان پر دھرتے ہیں جب کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں شیطان نے کرایا وہ ہمیں گمراہ کرتا ہے تو مولانا نے ان کے نظریہ کی تردید کرتے کہا کہ کیا شیطان تمہارا ہاتھ پکڑ کر گناہ کراتا ہے! ہرگز نہیں، تمہارے ارادہ کا بھی دخل ہے۔ یہ وہی معتزلہ کے مسلک کی تردید ہے جیسے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں تھی، فرق صرف ہدایت و گمراہی کا ہے۔تو دیکھیے مولانا کا قول کس قدر درست ہے! اور خطباء کا اپنے سامعین کو نیک عزائم پر آمادہ کرنے کے لیے اس طرح کے جملے کہنا نہ عین تقاضہ ہے بلکہ اس طرح کی باتیں سنی بھی جاتی ہیں جس سے لوگ ارادہ کے بعد قدم بھی اٹھائیں۔

<u>تنبیہ :</u> ہم یہاں آپ کے تیقظ کو آزمانا چاہیں گے، اس طرح کہ ہم نے (صفحہ پر ۹۷) لکھا ہے "ورنہ اللہ تعالیٰ کسی کا <u>ہاتھ پکڑ کر نہ</u> حق پر کھڑا کریں گے اور نہ اس فتنہ سے نکالیں گے"۔ اور اس سے تھوڑا نیچے جایئے تو یہ جملے پائیں گے "جب بندہ خود ہدایت نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے <u>چاہیں گے</u>" دیکھ لیجیے دونوں جملوں کے نیچے سطر بھی لگی ہے۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی ہے، یعنی معتزلہ کی تردید تو ہماری بات سے بھی معتزلہ کی تردید ہو رہی ہے۔ کیوں کہ ہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا ہاتھ پکڑ کر حق پر کھڑا نہیں کریں گے اسی طرح بندہ نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے چاہیں گے!

<u>توجیہ نمبر دو :</u> جس طرح ہادی اللہ تعالیٰ ہے اس طرح مُضِلّ بھی اللہ تعالیٰ ہے "اِنَّ اللّٰہَ

يُضِلُّ مَن يَّشَاءُ وَيَهدِيْ مَن يَّشَاءُ '' آپ کا ایک اعتراض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر تھا جس کی توجیہات بھی آپ نے پڑھ لیں، لیکن اُسی آیت شریفہ میں آگے ہے '' وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۔۔۔'' مولانا محمد سعد صاحب ہدایت کی نفی اللہ کے قبضہ سے کرتے ہیں، ہمیں بتائیے آپ یہاں ''ضلالت'' کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس آیت کی وجہ سے ضلالت کی نفی خدا کے قبضہ سے آپ کو کرنا ہوگی۔ العیاذ باللہ۔ اور اگر نفی نہیں کرتے تو تاویل کرنا ہوگی۔ اگر نفی کرتے ہیں تو باوجودیکہ وہ قرآن شریف کی بات ہے آپ خود گمراہ کہلائیں گے لہٰذا تاویل متعین ہوگئی۔ لہٰذا جس طرح آپ یہاں تاویل کریں گے بس آپ کو وہی تاویل حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں کرنی ہے۔ '' فَمَا كَانَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا '' (واللہ اعلم)

<u>توجیہ نمبر تین</u> : حضرت مولانا محمد سعد صاحب اس جملہ سے تقدیر کی اہمیت سمجھاتے ہیں۔ کسی چیز کی اہمیت بتانے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی، امید اور موت کو خطوط کھینچ کر سمجھایا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی تقدیر لکھ لی ہے اور وہ بندوں کے سارے کاموں سے (جس میں ایک کام ہدایت کا بھی ہے) فارغ ہو چکے ہیں تو اب وہ بتقاضہ اس کی سنت وعادت۔ نہ کہ قدرت۔ کسی کو ہدایت بھی نہیں دیں گے۔ یعنی جس طرح اور کاموں سے اللہ تعالیٰ فارغ ہو چکے ہیں اب کوئی کام انجام نہیں دیں گے تو اب ہدایت بھی نہیں دیں گے، لہٰذا ہدایت کی نفی اللہ تعالیٰ سے درست ہے۔ اس کا قرینہ دو احادیث ہیں۔ ایک '' جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ '' دوسری '' فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنْ عِبَادِهٖ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ ''۔ جس تقدیر کو سمجھانے کے لیے دسیوں احادیث وارد ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

<u>سوال</u> : اس توجیہ پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس توجیہ سے یہ تو ثابت ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نہیں دیں گے یعنی وقوع ہدایت کی نفی، لیکن حضرت مولانا کا قول وقوع کی نفی کا نہیں بلکہ ''امکان'' یعنی قدرت کی نفی کا ہے وہ ثابت نہیں ہوتا۔

جواب : علماء حضرات توجہ سے سمجھیں، دونوں ہی ''عدم انتفاع'' میں برابر ہے چاہے وقوع چاہے قدرت بایں معنی نفع حاصل نہ ہونے کی مراد میں دونوں برابر ہے۔

توجیہ نمبر چار : آپ حقیقت ومجاز کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ '' زَيْدٌ كَالاَسَدِ '' اللہ تعالیٰ ہادی بالذات ہیں بمعنی وہ حقیقی ہادی ہیں اور قرآن شریف '' اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ '' اور نبی علیہم السلام '' وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ '' دونوں ہادی بالسبب ہیں یعنی مجازی ہیں۔ حضرت مولانا مجازی معنی میں ہدایت کی نفی کر رہے ہیں اور یہ سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے معنی میں ہادی نہیں ہیں جیسے قرآن اور نبی (مجازی) بلکہ وہ تو ہادی بالحقیقت اور بالذات ہیں ان کے ہاتھ میں تو اصل ہدایت ہے۔

ہم اساتذہ جب کسی چیز کی حد وتعریف طلبہ کو سمجھاتے ہیں تو اچھی تفہیم کے لیے تعریف میں اگر مثبت قید ہے تو منفی کو بھی اور منفی قید میں مثبت کو بھی پیش کرتے ہیں، اس طرح حقیقت میں مجاز کو اور مجاز میں حقیقت کو بھی پیش کرتے ہیں تا کہ بات بذریعہ ضد واضح ہوجائے۔ تو مولانا یہاں مجاز کی نفی سے معنیٔ حقیقی کو تقویت دے رہے ہیں۔ گویا وہ درسی نزاکتوں کو یہاں بھی ملحوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر فی الحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کو ہادی نہ مانتے تو ۲۴ گھنٹے یہ جملے استعمال نہ فرماتے ''اللہ ہی کرتے ہیں''، ''اللہ ہی کے کرنے سے ہوتا ہے'' کیوں کہ ان ہی میں سے ایک کام ہدایت دینا بھی ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ : دیکھیے ابتک چار توجیہات ہوچکیں۔ ان توجیہات سے کسی بھی طرح کام بن جاتا ہے بلکہ کافی حد تک توجیہات ٹھیک بھی لگ رہی ہیں۔ کیوں کہ ساتھ میں قرائن بھی ہیں تو پھر اب ان کے خلاف کسی طرح کے اقدامات اختیار کرنا کتنا صحیح ہے!!۔

توجیہ نمبر پانچ : اگر کتب علم کلام کو دیکھیں تو ہدایت کے بارے میں ہم اہل السنہ والمعتزلہ

میں یہ اختلاف مذکور ہے۔عندالمعتزلہ ہدایت کا معنی ہے '' بیانِ طریق الصواب'' یعنی درست اور حق راستہ بتادینا۔اور ہمارے یہاں اس کا معنی ہے ''خَلقِ اهتداءٍ فِي العبد'' یعنی بندہ میں اہتداء کو پیدا کردینا (شرح عقائد ۹۶)۔حضرت مولانا محمد سعد صاحب جس ہدایت کی اللہ سے نفی کررہے ہیں وہ بیان طریق صواب کے معنی میں ہے تا کہ معتزلہ پر رد ہو جائے اور بذریعہ ضد یہ ثابت کررہے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معنی کر ہادی ہے کہ اس نے بندہ میں اہتداء کا خلق کیا ہے۔کیوں کہ قاعدہ ہے ''المفهوم لايعارض المنطوق''یعنی منطوق کا جومفہوم مخالف ہے وہ منطوق کے معارض نہیں ہوتا۔

اس توجیہ کا قرینہ یہ ہے کہ اگر مولانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہدایت نہ مانتے تو عام خلق من اللہ (اللہ کا خالق ہونا) نہ مانتے کیوں کہ ہدایت کی تعریف میں لفظ ''خلق'' ہے۔ جب خلق ہدایت کونہیں مانیں گے تو عام خلق کو بھی نہیں ماننا چاہیے (لیکن امکانی طور پر کیوں کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی ضروری نہیں لیکن ممکن ضرور ہے) (واللہ اعلم)۔

تنبیہ : مذکورہ بالا توجیہات کے روشنی میں ہر ذی فہم یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ تب تو مولانا کو یہ علوم نہ صرف مستحضر ہیں بلکہ یہ تو ان کے علمی تفنن اور علمی تنوع کی بھی دلیل ہے کہ وہ عام خطاب میں ایسے علوم اگل رہے ہیں جو درس میں بھی پسینہ کا ذریعہ ہے۔شاید یہ تائید غیبی ہے۔وہ حدیث شریف یاد کیجیے'' مَنْ عَمِلَ بِمَا عِلمَ وَرَّثه اللهُ عِلمَ مَالم يعلمْ ''جس میں ہے کہ بندہ جب اپنے علم پر عمل کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نہ سیکھے ہوئے علوم اپنی طرف سے عطا فرماتے ہیں۔شاید وہی ہورہا ہے۔

توجیہ نمبر چھ : ہمیں معترضین کی نا سمجھی پر تعجب ہے کیوں کہ جب وہ مولانا محمد سعد صاحب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اسباب کی نفی کرتے ہیں جیسا کہ آگے اس کا مستقل ذکر ہے تو اس کا

مطلب یہ ہوا کہ مولانا اسباب کی نفی کرکے صرف اللہ سے ہونے کو سمجھاتے ہیں کہ اسباب کو نہ مانو بلکہ یہ مانو کہ اللہ ہی کررہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی نفی کا اعتراض بھی کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا اللہ سے نہ ہونے کو سمجھاتے ہیں کہ اللہ سے نہ ہونے کو مانو یہ تضاد ہے۔ پس قول ساقط الاعتبار ہے۔ اس لیے یا تو اسباب کی نفی کا یا ہدایت کی نفی کا کوئی ایک اعتراض واپس لیجیے۔ اس تضاد کی ایک مثال سمجھیے۔ کفار مکہ کا خیال تھا بشر، نبی نہیں ہوسکتا (اگر غیر بشر نبی ہوتا تو ہم مان لیتے) اور بریلوی حضرات کا خیال ہے کہ نبی، بشر نہیں ہوسکتا۔ کس قدر دونوں نظریوں پر تعجب ہے!!! لیکن یہ تضاد دو شخصوں کی جانب سے ہونے کی وجہ سے ممنوع نہیں، جب کہ ہمارے مسئلہ میں تضاد شخص واحد کی جانب سے ہے اس لیے وہ ممنوع ہے۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر سات : قرآن حکیم کا ارشاد ہے ''وَلَو شَاءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ'' (پ ۱۴) اور ''وَلَو شاءَ اللهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فلا تكونن مِن الْجٰهِلِينَ'' (سورۃ انعام ۳۵) اس سے پہلے آیت شریفہ میں اسباب ہدایت۔ انبیاء ورسل علیہم السلام اور کتب سماویہ۔ کے ذریعہ ہدایت دینے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ پر ہونے کی طرف اشارہ ہے پھر یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام کو ہدایت سے نواز دیتے۔ جس میں اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ہم اگر چاہتے تو بغیر ان مذکورہ اسباب ہدایت کے ہدایت دیتے، لیکن ہماری مشیت جس طرح تمام لوگوں کو ہدایت دینے کی نہیں ہے اس طرح بغیر اسباب کے ہدایت دینے کی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خلاف دستور ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے تاکہ وہ مشقتیں برداشت کرکے خدا کے نائب بن کر لوگوں کو ہدایت کی طرف لائیں تو بات بالکل واضح ہے اب براہ راست اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والے نہیں کیوں کہ دستور، دستور ہوتا ہے ''لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ'' تو اس معنی کر اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی نفی درست ہے بلکہ حضرت مولانا محمد سعد کے اس جملے کو سننے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہی مطلب ان کے نزدیک ہے، کیوں کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام اور

ان کی مشقتوں کا ذکر ہدایت کے ساتھ متصلاً کیا ہے۔آپ سن لیجیے۔

اس کو علمی زبان میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ''کلمۂ 'لو' زمان ماضی میں شرط کے منتفی ہونے سے اس میں جزا کے منتفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔یعنی جب ماضی میں مشیت منتفی ہے تو ہدایت بھی منتفی ہے جیسا کہ اسی طرح اثبات توحید میں آیت شریفہ ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' میں استدلال کیا جاتا ہے۔(واللہ اعلم)۔

نوٹ : رہا یہ سوال کہ ٹھیک ہے ہم نے ان تاویلات وتوجیہات کو مان لیا لیکن حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو ایسی باتیں عام مجمع میں نہیں کہنی چاہیں۔تو جواب یہ ہے کہ جب ان کے قول کی توجیہ کر سکتے ہیں تو طریقے کی بھی کر لیجیے کہ وہ عام مجمع میں کیوں کہتے ہیں۔دراصل قائل کے پاس عام مجمع میں کہنے کی بھی وجہ ہوتی ہے۔مثلا اس سے اگر چہ ابتداءً ایک قسم کی وحشت ہوتی ہے لیکن وہ ایک وقت کے بعد ختم بھی ہوجاتی ہے اور اس سے لوگوں میں علمی شعور علمی بیداری آتی ہے ورنہ لوگ وہیں کے وہیں رہ جائیں۔(⬅) جیسے متعلم اور معلم جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے،اسی طرح تبلیغی احباب میں بھی تدریجی ترقی ہوتی ہے مثلاً ایک شخص چلہ لگایا ہوا ہو،دوسرا چار ماہ لگایا ہوا ہو دونوں کے علم وبیان اور فکروں میں ضرور فرق ہوگا۔توجیسی بلند باتیں سنائی جائیں گی اسی قدر ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا۔مکاتیب میں لکھا ہے کہ ''حضرت جی کی باتیں حکیمانہ ہوتی تھیں کبھی اجمال کبھی تفصیل۔جب اجمالی باتیں ہوتی تھیں تو سننے والے سمجھنے سے قاصر ہوجاتے تھے۔۔۔بڑے بڑے علماء کو اشکالات ہوتے تھے لیکن جب تفصیلی باتیں ہوتی تھیں تو اشکالات ختم ہوجاتے تھے'' (مکاتیب ۴/۳۲۴) معلوم ہوا کہ صرف سطحی باتیں ہی نہ کی جائیں بلکہ معیار سے بلند باتیں بھی بتائی جائیں تاکہ عروج وترقی حاصل ہو۔(➡)

آپ تو قول کی بات کررہے ہیں کہ مولانا کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیں ہم فعل وعمل کی

مثال دیتے ہیں کہ ایسا عمل بھی نہیں کرنا چاہیے جولوگوں کی سمجھ کے خلاف ہو پہلے آپ سوچیے وہ مثال کیا ہوگی؟ وہ مثال ہے خود دعوت وتبلیغ کے کام کی۔ کہ ایسا کام جو آج تک صدیوں میں ہزاروں بڑے بڑے علماء نے نہیں کیا تو پھر مولانا محمد الیاس صاحب کو بھی نہیں کرنا چاہیے ـــــــ۔ اگرچہ نفس دعوت وتبلیغ کا کام تو ہر زمانہ ہوا ہے لیکن مروجہ طریقہ سے نہیں ہوا یہ ہے فعل کی مثال !لیکن جاری رہا تو نہ صرف وحشت ختم ہوگئی بلکہ لوگوں نے اسے گلے لگایا۔ بس یہی حال قول کا بھی ہے۔

(۴) اسباب دنیویہ کی نفی کا اعتراض :

توجیہ نمبر ایک: حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے جس جملے سے اعتراض دِکھ رہا ہے وہ بتقدیر مضاف ہے اس مضاف کی جانب تشحیذ اذہان کے لیے۔ مثلا وہ کہتے ہیں دکان کو چھوڑو اور زراعت کو چھوڑو ان سے کچھ نہیں ہوتا " هَاجِرِ الزِّرَاعَةَ " " اَیْ هَاجِرْ یَقِیْنَ الزِّرَاعَةِ " توجیہ اس لیے کہ اسباب کے اختیار کرنے کی تعلیم شریعت کی ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یقین کی کمزوری سارے گناہوں کی جڑ ہے اور گناہ کو چھوڑ نا ہجرت ہے اور وہ بھی حقیقی تو اب کس قدر درست بات ہے کی نفی اسباب کے یقین کی ہے اور ہجرت پر آمادگی بھی ہے! خلاصہ یہ کہ اسباب کی نفی کے اسلوب میں ان کے تاثیر کی نفی ہے۔

توجیہ نمبر دو : ہرکوئی جانتا ہے کہ اسباب نے لوگوں کے دلوں پر ایسا غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے کہ خدا کی جگہ لے رکھی ہے، اگر کچھ باقی ہے تو صرف سر جھکا کر سجدہ کرنا۔ اسی لیے زمانہ کے چھوٹے بڑے اسٹیج کے جتنے فعال وباشعور خطباء ہیں وہ سب ہی ہر قسم کے حالات قومی تصادم، مذہبی مداخلت اور سماوی وارضی آفات وغیرہ میں ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی سب سے مضبوط تدبیر یہی بتاتے ہیں کہ لوگ اپنے دلوں میں خدا کا یقین مضبوطی سے پیدا کرلیں، اور اپنی زندگی

ٹھیک کرلیں ان کی صحیح توجہ کے باوجود وہ اس لیے خاطر خواہ کامیاب نہیں کہ تبدیلۂ یقین کی کوئی مستقل جدوجہد بیانات کے بعد عملاً اختیار نہیں کی جاتی، لیکن دعوت وتبلیغ نے یہی طریقہ اپنا کر لوگوں سے عملی جدوجہد کروائی، ان کی جان ومال کی اور ان کے اوقات کی تشکیل کی جس کے نتیجہ میں اس نے اپنا وطر ومقصود حاصل کیا اور لوگ ایسے مضبوط یقین پر قائم ہوئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مٹے نشانات قدم کو زندہ کیا اور صحابہؓ کی طرح تسخیر عالم سے سرفراز ہوئے۔

(⬅) کیوں کہ پوری شریعت کا مقصود بھی یہی ہے، اسباب اختیار کرنا مقصود نہیں وہ صرف ایک ظاہری تدبیر ہے اسی لیے پہلی بار چلہ لگانے والا بھی دعوت کے عمومی ماحول سے اتنے کلمات تو سیکھ ہی لیتا ہے کہ اسباب سے کچھ نہیں ہوتا صرف اللہ ہی کرتے ہیں۔ جب سب ہی کے بیان میں اسباب کی نفی کا اسلوب پایا جاتا ہے پھر حضرت مولانا محمد سعد صاحب ہی پر اعتراض کیوں؟ اور اگر وہ عام لوگوں سے زیادہ اسباب کی نفی کریں تو یہ ان کے درجہ ''متکلم'' کا تقاضہ ہے جو اصول بلاغت کے مطابق ہے۔ (➡)

اب کچھ لوگ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اسباب کی نفی کا اعتراض کر کے پھر امت کو اسباب کی غلامی میں دینا چاہتے ہیں، حیرت ہے لوگوں کی سمجھ پر! ایسی بھی کوئی نادانی ہوتی ہے یا پھر کسی کے خلاف ان کے دلوں میں آگ بھڑکتی ہے۔ خدانخواستہ معترض کے منشا کے مطابق اگر امت کے ایمان ویقین بے اثر وکمزور ہوجائیں پھر دین ہی کیا رہے پھر تو معترض ہلاک وبرباد ہوجائے۔ ہمیں جواب دیجیے کیا آں حضرت ﷺ نے بعض حالات میں اسباب اختیار کرنے سے نہیں روکا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمندر میں گھوڑے نہیں ڈالے۔ کیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے زہر نہیں کھایا؟ کیا عقبہ بن نافع رحمہ اللہ تعالیٰ مع اپنے لشکر افریقہ کے جان لیوا جنگل میں داخل نہیں ہوئے؟ کیا قرآن کریم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنگ حنین میں

جب ان کی نگاہیں ظاہری سبب لوگوں کی کثرت پر اٹھیں تو یہ کہہ کر ''اِذَا اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ'' اور باغات کی طرف اٹھیں تو ''لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ'' کہہ کر آگاہ نہیں کیا ؟ جواب دیجیے!

(⬅) حدیث شریف میں کھانوں میں لذتیں ڈالنے کی اور بازاروں کے نرخ میں گھٹاؤ بڑھاؤ کی ظاہری نسبت چھوڑ کر خدا کی طرف کی گئی ہے چناں چہ اس حدیث شریف میں بھی یہی بات ہے جس میں خارش زدہ اونٹ کے بارے میں ایک شخص نے ''ظاہری سبب کے مؤثر ہونے پر استدلال کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''ظاہری'' معارضہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب صحت یافتہ اونٹ خارشی اونٹوں سے ملتا ہے تو وہ اسے بھی خارشی بنا دیتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے خیال کو رد فرمایا یہ کہہ کر ''فَمَنْ اَعْدَى الاَوَّلَ'' کہ سب سے پہلے اونٹ میں کس اونٹ نے اس مرض کو متعدی کیا (جب کہ اس وقت یہ مرض کسی بھی اونٹ میں نہیں تھا) معلوم ہوا کہ حصول یقین اور مؤثر حقیقی کی طرف توجہ دلانے کے لیے بظاہر اسباب کی نفی کا اسلوب اختیار کیا جاسکتا ہے، تا کہ معلوم ہو کہ اسباب کی کوئی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ اسی لیے ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے موثر حقیقی کی طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے ''اِنما هُو فِعلُ فاعِلِ الحقِيقِي''۔ (شرح نخبہ صفحہ ۱۰۰) اور قرآن شریف میں بھی ہے ''وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' اور ''فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ'' یہ نسبتیں خود ظاہری اسباب کی نفی پر دال ہیں پھر حقیقی نسبت ''خدا'' کی طرف دعوت دینا رفض شریعت کیسے؟ اور سب سے بڑے غور کی بات تو یہ کہ صحابہؓ کی نگاہیں ظاہری اسباب کی طرف اٹھتی ہی نہیں تھیں تب ہی تو وہ ''کامل الایمان'' کہلائے پھر بھی ''رفض شریعت'' لازم نہیں آیا تو اب کیوں؟ کیا حقیقت شریعت بدل گئی؟ (➡)

اگر عوام ایسی باتیں کریں تو دکھ کی بات نہیں لیکن علماء حضرات ایسی بہکی اور بے تکی

باتیں کریں یہ انہیں زیب نہیں دیتا، کہاں گئے علوم، علماء ہو کر شعور وتیقظ کھو بیٹھنے کا اور عام طوفان میں بہہ جانے کا کیا مطلب!! عالم کو چاہیے کہ جب زبان استعمال کرے تو علمی زبان استعمال کرے۔ مذکورہ باتیں ذہن نشین رکھ کر توجیہ سمجھیے امت کو اسباب کی غلامی سے نکالنے کے لیے ایسی شدت وتغلیظ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کلام موافق حالات اور یہ اسلوب مخاطبین کی رعایت کے مطابق ہے، ''کما ھو اصل فی البلاغۃ'' یہ باتیں ہمیں قرآن وحدیث ہی نے تو سکھائی ہیں، اسلوب اگر اتنا سخت۔ بظاہر اسباب کے نفی کا۔ نہ ہوگا تو مردہ ذہنیت میں کبھی جان نہیں پڑے گی'' لاصلوۃ لجار المسجد الافی المسجد'' میں دیکھیے کیا یہ نفی حقیقت پر مشتمل ہے؟ یہ فی الحقیقت اسباب کی نفی نہیں ہے، مردہ ذہنیت میں جان ڈالنے کے لیے تغلیظ ہے۔

توجیہ نمبر تین : آپ یہ نہ کہیں کہ آپ اعتراض کو صحیح طور پر سمجھیں ہی نہیں، کیوں کہ مولانا محمد سعد صاحب خود اعمال کو اسباب نصرت تصور کرنے کو کہتے ہیں یہ ہے اصل اعتراض! اب تو کوئی اعتراض ہی نہیں، کیوں کہ ترک اسباب علی حدہ ہے اور اسباب نصرت علی حدہ۔ چناں چہ قرآن وحدیث میں اس کی بھی دلیل اور نظیر ہے۔ قرآن حکیم نے مثلاً، رزق کی تنگی، بیماری اور دیگر ہر قسم کی تکلیف سے نجات کے لیے تقویٰ کی راہ بتائی ہے۔'' وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ''۔ نیز نماز کو روزی کا، زکات کی ادائیگی کو مال میں اضافہ کا اور حج کو غنی کا ذریعہ بتایا ہے۔

(←) حضرت مولانا سعید احمد خان صاحبؒ نے بھی بجائے اسباب ظاہرہ کے اسباب نصرت کا تذکرہ دل نشین انداز میں فرمایا ہے ''نیز اسباب نصرت یعنی وہ اسباب جن پر ان کی (صحابہؓ کی) مدد ہو رہی تھی یعنی اتباع سنت رسول، اللہ کی اطاعت کا جذبہ، اللہ پر توکل اور اعتماد کہ اس کی طرف سے کامیابی اور ناکامی کے فیصلے ہوتے تھے۔ بدر کی جنگ میں اسباب نصرت اختیار کیے گیے تو کامیابی آگئی اور احد میں اسباب نصرت میں جب غلطی ہوئی تو نصرت الٰہی

ہٹ گئی (اطاعت میں کمی)۔ خندق میں اسباب نصرت اختیار کیے تو اللہ کی مدد آ گئی اور حنین میں اعتماد علی اللہ میں کمی آ گئی تو فتح پھر شکست میں بدل گئی پھر جب اعتماد علی اللہ پیدا ہوا تو شکست فتح سے بدل گئی۔ موتہ اور تبوک میں اسباب نصرت اختیار کیے گیے تو کامیابی حاصل ہوئی۔ ہر وقت یہ لحاظ رہے کہ ہم کن اسباب میں چل رہے ہیں؟ جیسے اسباب ویسا ہی نتیجہ سامنے آئے گا خواہ کوئی ہو یا بڑے سے بڑے اہل اللہ ہوں۔۔۔ (مکاتیب ۴۳۴/۵ اور ۱۵۹/۲)۔

شیخ ابرار احمد دھلیوی نے محققین کا قول یہاں تک لکھا ہے کہ نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو عبادت پر نہ ہو۔ محققین فرماتے ہیں عمل چھوڑا تو نہ جائے لیکن نظر عمل سے ہٹا دی جائے۔ پھر لکھا ہے کہ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ ''ایاک نعبد'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ مقصود ذات حق ہیں۔ صرف عبادت مقصود نہیں۔۔۔ (فیض ابرار ۵۶/۴) دیکھیے محققین نے تو ایک درجہ میں عبادت کو بھی غیر مقصود بتایا پھر اسباب کا کیا سوال؟ شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم بھی فرماتے ہیں کہ ''نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں''۔ (اصلاحی خطبات حصہ اول صفحہ ۱۷۴) اسی وجہ سے تو فرشتہ جب نبی کے پاس مدد کے لیے آتا ہے تو نبی اس کی مدد لینے سے انکار کر دیتا ہے '' اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا '' کہ تیری ضرورت نہیں۔ جب خدا کو معلوم ہے اور ہمارا اس پر یقین ہے تو ہم کیوں اسباب سے مدد طلب کریں! تو اس طرح کے یقین پر امت کو لانے کے لیے اور اسباب سے یقین کو ہٹانے کے لیے اس طرح اسباب کی نفی کا اسلوب کیوں اختیار نہیں کیا جا سکتا! (➡) بلا شبہ شریعت میں اسباب اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے لیکن ان کے یقینوں سے بچانے کی تعلیم اس سے زیادہ قدم قدم پر دی ہے اسے بھی ملحوظ رکھیے۔ لوگوں کو چاہیے کہ قرآن وحدیث کی اسباب اختیار کرنے کی تعلیم کو اس کے اعتدالی جہت و پہلو پر منطبق کریں، اس کو اسباب کی غلامی پر محمول نہ کریں، اس قدر اسباب اختیار کرنے کو اسلام کی تعلیم نہ سمجھیں کہ آدمی ان کے اختیار میں ان کا غلام بن جائے اور ان کے یقین کا بھی شکار ہو جائے۔ جس سے شرک کی بو آوے۔

جدید تعبیر اعتراض کی چیز نہیں :

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا کہنا ہے کہ اسباب دنیویہ پر غیبی کوئی وعدہ نہیں، وعدے اعمال پر ہیں۔لہٰذا اسباب پر اعتماد کے بجائے اعمال پر اعتماد کر کے اعمال کی فکر رکھو۔ یہ اتنی درست بات ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ قرآن وحدیث کے موافق ہے، اس کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا، ہاں یہ ایک ایسی جدید بات، جدید تعبیر ہے کہ آج تک ایسا کسی نے نہیں کہا! تو کیا آج تک کسی کا نہ کہنا اعتراض کی دلیل ہے؟ پھر تو آپ اپنی اس اکلوتی سنہری سوچ کو بازار لیجائیے اور اس کی بڑی قیمت حاصل کیجیے۔ایک درست بات کو جدید تعبیر میں اس مقصد کے پیش نظر پیش کرنا تاکہ لوگ اپنی پرانی روایت وعادات کو چھوڑ کر حقیقت کو حاصل کریں یہ تو لائق تعریف عمل ہے نہ کہ قابل جرح وتنقید۔

ہم اس کی ایک نظیر پیش کرتے ہیں۔(⬅) حضرت حسن بصری "کلام کرنے میں" تمام لوگوں میں سب سے زیادہ انبیاء کے مشابہ تھے "وَلَقَدْ کَانَ الحسنُ البصرِیُّ اَشبہَ الناسِ کلامًا بِکلامِ الانبیاءِ واَقربَھم ھَدیاً مِن الصحابۃِ ﷺ" ان سے کہا گیا "یَا اَبا سعید اِنَّكَ تَتکلمُ بِکلامٍ لایُسمعُ مِن غیرِكَ فَمِن اینَ اخذتَہ قال مِن حذیفۃَ بنَ الیمانِ ﷺ وَقِیلَ لحذیفۃَ نراكَ تتکلمُ بکلامٍ لایُسمعُ من غیرِك فمِن اینَ اخذتَہ قال خَصّنِی بِہ رسولُ اللہ ﷺ۔ کان الناسُ یسألونَہ عنِ الخیرِ و کنتُ اسألُہ عنِ الشرِ۔۔۔(احیاء علوم الدین ۸۳/ا دسویں علامت) دیکھا حضرت حسن اور حضرت حذیفہ کا طرز عمل تمام صحابہ وتابعین کے طرز عمل سے بالکل جداگانہ ہے اور لائق تعریف ہے نہ کہ قابل اعتراض۔۔۔(➡) عامۃً تمام مشائخ تصوف اعمال ومعروفات پر زور دیتے ہیں، لیکن حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیے وہ فرماتے ہیں "میرے نزدیک ایک منکر ایک گناہ کو چھوڑنا ہزار

معروفات پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے۔اب یہ بات کسی نے نہیں کہی اس لیے اس کو غلط کہیں گے یا اس کی حقیقت پر نظر کر کے اس کو ان کی بصیرت کی دلیل سمجھیں گے۔ یادرکھیے، بات کا جدید اسلوب، جدید تعبیر اوقع فی النفس کا ایک مؤثر طریقہ ہوتا ہے۔ چناں چہ ان کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ''اِتَّقِ المحَارِمَ تَكُنْ اَعْبُدَ النَّاسِ'' لہٰذا جدید تعبیر اختیار کرنا بوجہ مؤثر طریقہ یہ ان کے بلند رتبہ ہونے کی دلیل ہے نہ کہ قابل اعتراض چیز۔

مذکورہ اعمال پر وعدوں کی بات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ۔نے بھی لکھی ہے۔حضرت نے تصوف کی طویل حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے جس میں '' خوف ورجا'' کا ذکر ہے''۔۔۔۔جب اس کی جبلت پر یقین کا غلبہ ہوا اور اس نے ہر جہت سے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تو لازمی طور پر'' رجا اور خوف'' تمام تر اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم اور اس کے وعدوں سے متعلق ہو گیا اور اب اس کا اعتماد اسباب کے پیدا کرنے والے سے متعلق ہو گیا نہ کہ اسباب سے۔۔۔۔'' (ازالۃ الخفاء مترجم ج ۴ ص ۳)۔حضرت نے بھی فرمادیا کہ یقین کا تعلق وعدوں سے ہو گیا اور اس کا اعتماد اللہ سے وابستہ ہو گیا نہ کہ اسباب سے، اورر یہ تو بہت بڑا درجہ ہے تصوف میں۔اب اس پر بھی اعتراض کریں گے؟۔بلکہ حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ'' اسباب کے بغیر بھی مسببات وجود پذیر ہو سکتے ہیں، کیوں کہ اسباب صرف اسباب ہیں، خدا نہیں ہیں۔مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہیں۔(رحمۃ اللہ الواسعہ ۱/ ۱۵۲)۔

(۵) اعتراض، اجرت علی التعلیم، اجرت علی الزنا کے مثل ہے: توجیہات سے پہلے چند چیزیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اسلام کا مزاج اشاعت علم کا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو اس قدر تعلیم میسر ہو جس طرح انہیں ان کی دنیوی ضرورتیں کھانا پینا اور لباس اور سواری وغیرہ۔اس لیے اب اسے کسی بندھن میں بند کرنا اس نظریہ کے خلاف ہوگا۔

(۲) مذکورہ نظریہ کی وجہ سے اسلام کا یہ بھی متفقہ نظریہ اور فیصلہ ہے کہ اسلام کی تعلیم بلا اجرت ''مفت'' ہے۔ چناں چہ قرونِ ماضیہ کو چھوڑیے دورِ حاضر کے علماء عرب نے بھی یہ بات لکھی ہے اور ہم نے اپنی کتاب ''اولاد کی تربیت'' میں اس سے اقتباسات لیے ہیں کیوں کہ قرآن کا نعرہ ہے ''وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ''۔

(۳) اجرت علی التعلیم ایک تعلیمی اہمیت کے پیش نظر بعد میں ''وقت کے معاوضہ'' کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے، جب لوگوں کا رجحان دین وایمان اور اس کی تعلیم کی طرف کم ہو گیا۔

(۴) بعض مسائل کو سمجھنے میں عرف کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ ہمارے جمہوری ملک میں تعلیم کا نظام مسلمانوں کی رقومات پر برقرار ہے۔ جس کی وجہ سے علماء اور عوام کے ذہن میں تعلیم کا ایک ایسا نقش بیٹھا ہوا ہے کہ تعلیم تو اجرت ہی کے راستے حاصل ہو سکتی ہے یعنی تعلیم پر تنخواہ کا لینا اور دینا نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ ضروری بھی، کیوں کہ تعلیمی ادارے چلانے والے خود علماء حضرات ہیں، تنخواہ لینا اور دینا انہی کے ذریعہ ہوتا ہے تو تعلیم بلا اجرت کا تصور ایک گناہ کے مرادف ہو گیا ہے۔

توجیہ : مذکورہ امور کی روشنی میں سمجھیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تعلیم پر حاصل کی جانے والی اجرت کو اجرت علی الزنا سے تشبیہ دے کر تعلیم کی اصلیت اور اس کی وہ حقیقت سمجھانا چاہتے ہیں جس کی تعلیم خود مقتضی ہے۔ جن کا اشارہ ہم نے کیا، خصوصاً دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور دورِ تابعین اور تبع تابعین۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ کی طرف لیجانا چاہتے ہیں جس میں تعلیم کا یہ طریقہ نہیں تھا جو آج ہے کیوں کہ دورِ نبوی اور اس کے بعد بھی مکمل تین صدی تک تعلیم کا اصل ٹھکانہ مسجد تھی۔ ہم نے ماقبل میں لکھا ہے کہ موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء بقول علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ چوتھی صدی سے ہوئی۔ سب سے پہلے اہل نیشاپور نے ''مدرسہ بیہقیہ'' کی بنیاد

ڈالی اس کے باوجود لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، کیوں کہ عام رواج دورِ نبوی سے علم کو مسجد سے لینے کا تھا۔ نیز مسجد سے ہر کوئی علم حاصل کر سکتا تھا اور مدرسہ سے لینے میں یہ بات نہیں تھی۔ اور ایسا کیوں نہ کرتے جب پوری دنیا میں تبلیغ بلا اجرت ہو رہی ہے تو تعلیم کے بلا اجرت ہونے میں کیا دقت ہے !!

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی بات قابل اعتراض اس وقت ہوتی جب وہ فقہی مسئلہ کی رو سے ناجائز اور حرام فرماتے، لیکن یہاں تو فقہ کا تصور بھی نہیں، یہاں تو تعلیم کی اصلیت وحقیقت کو آشکارہ کرنا مقصود ہے، کیوں کہ تعلیم کے علی الاجرت جائز ہونے کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ لوگ تعلیم کی اصل حقیقت سے بالکل نابلد رہیں۔ نیز اعتراض سے تو یہ شبہ لگتا ہے کہ اجرت واجب وضروری ہے جو خلاف شرع ہے۔ بلکہ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں تو یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ حضرت مولانا نے اس بارے میں زیادہ شدت سے بھی کام نہیں لیا۔ اگر شدت بھی اختیار کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔

کیوں کہ اب تو علمی انحطاط اس قدر ہے کہ ۔۔۔۔ خود بعض علماء حضرات کو بھی نفس تعلیم کا مسئلہ معلوم نہ ہوگا وہ تو اصلاً ہی اجرت کو جائز ولازم سمجھتے ہوں گے، اگر یہی بات ہے تو مسئلہ سنگین ہو جائے، کیوں کہ ناجائز کو جائز پھر جائز کو واجب اعتقاد کرنا ہوا، العیاذ باللہ۔ پھر تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حکم ہو۔ چناں چہ ''اِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الانْبِيَاءِ'' حدیث شریف کے تحت لکھا ہے کہ ''هٰذَا اِشْعَارٌ بِاَنَّ طَالِبَ الدُنيا لَيْسَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الوَرَثَةِ'' اور امام غزالی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے تو علمائے اخرت کی پہلی علامت میں دنیا کے فانی اور عقبیٰ کے باقی سمجھنے کو نہ صرف اقل علم کہا ہے بلکہ ''اقل ایمان'' بھی کہا ہے ''قَالَ الغَزَالِي : اَقَلُّ الْعِلْمِ بَلْ اَقَلُّ الاِيْمَانِ اَنْ يَّعرِفَ الدُّنيا فَانِيَةٌ وَاَنَّ العُقْبٰى بَاقِيَةٌ'' (احیاء اول صفحہ ۶۴، مرقات

۲۸۱/۱)۔ پھر اجرت کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔!! لہٰذا اب حضرت مولانا کے قول کا مطلب ہوا ''اِکْتِسابُ الْاُجْرَۃِ بَالتَّعلِیْمِ بِنَاءًا علی الاصلِ کَاَخْذِ الاُجْرَۃِ عَلٰی الزِّنَا ''۔یعنی یہ تشبیہ زمانہ خیر القرون کے لحاظ سے ہے۔ مولانا کے قول سے فائدہ یہ ہوگا کہ تعلیم کا اصلی علم لوگوں کو ہوگا اور اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی اتباع کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

سوال : بات تو ٹھیک ہے لیکن حضرت مولانا نے جو تشبیہ دی ہے وہ قبیح ہے جو مناسب نہیں۔

جواب : جب وقت کا تقاضہ قبیح چیز کے ساتھ تشبیہ کا ہو اس وقت غیر قبیح چیز سے مقصود و مراد حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ تشبیہ برمحل ہے اور مطابق اصول ہے۔(←) کون جہل کو عقل سے بہتر کہے گا لیکن بعض مواقع میں جہل، عقل سے بہتر ہوتا ہے جب عقل، علم صحیح کے انکار کا سبب ہو ''فَالجھلُ خَیرٌ مِن عقلٍ یَدعُوا اِلیٰ اِنکارٍ '' (احیاء ج ۱ صفحہ ۷۸) جس طرح بعض جھوٹ اس سچ سے بہتر ہوتا ہے جس سچ سے فتنہ پیدا ہوتا ہو شیخ سعدی (اصلاحی خطبات ۱۴۰/۶) (→) اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول مذکور میں یہ جملہ کہ ''زنا کار لوگ، تعلیم قرآن پر اجرت لینے والوں سے جنت میں پہلے جائیں گے''۔ یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے جو حیاۃ الصحابہ میں موجود ہے ''یَااَھْلَ العِلْمِ وَالقُرْاٰنِ لَا تَاْخُذُوا لِلْعِلْمِ وَالقُرْاٰنِ ثَمَنًا فَتَسبِقُکُمْ الزُّنَاۃُ اِلٰی الجَنَّۃِ '' (حیاۃ الصحابہ ۳۳۳/۳)۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس جگہ تعلیم کی بحث کے تحت تعلیم و تبلیغ کا فرق بھی واضح ہو جائے۔

تعلیم و تبلیغ میں فرق :

سطور بالا میں توجیہ کے ضمن میں تعلیم کی اہمیت بھی آ گئی، اب ہم یہاں تعلیم و تبلیغ میں کیا فرق ہے وہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں، کیوں کہ بہت سے علماء حضرات سے بھی کبھی کبھی سننے کا اتفاق ہو جاتا ہے کہ علماء حضرات بھی مدرسہ میں بذریعہ تعلیم، تبلیغ بھی انجام دے رہے ہیں'' یہ جملہ کتنا

درست ہے وہ آپ ذیل میں پیش کردہ فرق سے سمجھ لیں۔

(۱) حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''بے طلبوں کو دین دینا تبلیغ ہے اور طالبین کو دینا تعلیم ہے''۔

(۲) دونوں کا مادہ علی حدہ علی حدہ ہے۔ ایک کا ہے ''علم'' دوسرے کا ہے ''بلغ'' یعنی دونوں میں کسی طرح بھی لغوی اتحاد نہیں ہے کیوں کہ دونوں کے مفہوم میں ترادف بھی نہیں ہے جیسے قعد اور جلس میں ہے جس کو اتحاد عرفی کہتے ہیں۔

(۳) دونوں بحسب المصداق بھی ایک نہیں ہیں۔ جیسے اسلام اور ایمان بحسب المصداق ایک ہیں۔ کیوں کہ اتحاد بحسب المصداق کے لیے ''عدم مغایرت'' ضروری ہے جو ثابت نہیں پھر کیسے مساوی؟ ہاں اگر اصطلاحًا دونوں میں عدم مغایرت ثابت ہو جائے تو تساوی کی نسبت بن جائے گی۔

(۴) قرآن وحدیث میں دونوں کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ''یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ۔۔۔'' بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیۃ '' اور تعلیم کے لیے ہے'' ۔۔۔ **وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ** ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۵) عملاً دیکھا جائے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ''تبلیغ'' نقل وحرکت میں اور ''تعلیم'' مسجد نبوی میں اور صفہ پر بیٹھ کر ثابت ہے۔ یعنی واقع اور خارج کے لحاظ سے بھی اتحاد نہیں۔

(۶) تبلیغ بلا معاوضہ رائج ہے اور تعلیم بالمشاہرہ رائج ہے۔

(۷) تبلیغ سے ہر کوئی مستفید ہو رہا ہے، مدارس کی تعلیم سے ہر شخص مستفید نہیں ہو رہا ہے۔ اب بتائیے کہ مدارس میں تعلیم دینا تبلیغ بھی ہے! ہاں تبلیغ میں تعلیم کا انضمام ہو جاتا ہے۔ المختصر۔

مسلمانوں میں دعوت

(←) تعلیم وتبلیغ کے فرق کے ضمن میں سمجھ میں آتا ہے کہ مختصراً اس اعتراض کا جواب

بھی دے دیا جائے جو بعض حضرات کو ہوتا ہے کہ تبلیغ تو کفار میں ہونی چاہیے، مسلمانوں میں دعوت وتبلیغ درست نہیں ۔ جواب : دعوت جس طرح کفار میں ہوتی ہے اس طرح ''شرعاً'' مسلمانوں میں بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ دونوں میں وجہ دعوت علی حدہ علی حدہ ہے۔ کفار میں دعوت انشاء ایمان یعنی قبول ایمان کے لئے ہے اور مسلمانوں میں تجدید ایمان اور امتثال اوامر کے لیے ہے۔ نبی دونوں ہی کاموں کے لیے مبعوث ہے۔ اسی لیے امت کی دو قسمیں بنتی ہیں۔ ایک امت اجابت (مسلمان) دوسری امت دعوت (کفار) چناں چہ عملاً کفار کے پاس جانے کی طرح عملاً صحابہؓ کا ایک دوسرے کے پاس جانا (گشت وملاقات) بھی تجدید ایمان کے لیے احادیث سے ثابت ہے۔ (حیاۃ الصحابہ)۔ نیز قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ اور نبی پر ''داعی'' کا اطلاق ہوا ہے مثلاً ''وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلٰى دَارِ السَّلَامِ'' یعنی اللہ اور رسول دونوں ہی دعوت کے داعی ہیں کیوں کہ داعی عام رکھا گیا ہے نہ تو دعوت کفار سے مقید ہے اور نہ تو مسلمان کی دعوت کی نفی ہے۔ اسی لیے تو امت کی دو قسمیں بنیں۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں میں تبلیغ شرعاً ثابت ہے۔ (➡)

(۲) اعتراض، معجزہ کا سبب دعوت ہے یعنی معجزہ دعوت کے ساتھ خاص ہے، نبی کے ساتھ نہیں

توجیہ : نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ بلکہ ہر ہر شخص میں۔ دو دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت محمد بن عبداللہ ہاشمی کی۔ دوسری ''محمد رسول اللہ'' کی۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ ''معجزہ'' کا تعلق محمد بن عبداللہ کی جہت سے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت سے ہے۔

توحضرت مولانا محمد سعد صاحب یہی تو کہہ رہے ہیں کہ معجزہ ''محمد رسول اللہ'' کی جہت کے ساتھ خاص ہے، اگر یہ نہ مانیں تو اسلوب کلام بتاتا ہے کہ پھر معجزہ کا تعلق ''محمد بن عبداللہ'' کی جہت کے ساتھ خاص ہے جو قطعاً غلط ہے۔ اب چاہے نبی کی نبوت اور اس کی رسالت اس کی

ذات پر منتہی ہوگئی جس کی وجہ سے انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن ''کار نبوت''، یعنی ''دعوت و تعلیم وغیرہ'' اب بھی باقی ہیں تو معجزہ کا تعلق ''دعوت سے'' بتلانا کیسے غلط ہوا۔ یہی بات تو صحیح ہے!

اسی وجہ سے تو ولی کی کرامت پر ''معجزہ'' کا اطلاق بایں معنی ہوا ہے کہ وہ اپنے نبی کی نبوت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ ولی میں بھی دو جہتیں ہیں۔ ایک اس کی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے ''خارق عادت امر'' میں کرامت کی جہت اور دوسری اس کے نبی کی طرف نظر کرتے ہوئے ''وہی کرامت'' میں معجزہ کی جہت۔ کیوں کہ لکھا ہے کہ اگر یہ ولی ''نعوذ باللہ'' اگر اس ''کرامت'' میں اپنی نسبت نبی کی طرف نہ کرے بایں معنی کہ اس نبی کے امتی ہونے کو تسلیم نہ کرے بلکہ مستقل بالذات ہونے کا مدعی ہو تو نہ وہ ولی ہوگا۔ بلکہ وہ کافر ہوگا۔ نہ ''خارق عادت'' کرامت۔ یعنی ولی کی کرامت میں بھی معجزہ کی جہت غالب ہے خلاصہ یہ کہ خارق عادت امر جو بھی ہو'' معجزہ یا کرامت'' وہ معجزہ ہے چاہے براہ راست نبی سے صادر ہو تب بھی اور اس کے کسی امتی سے صادر ہو تب بھی البتہ فرق یہ ہے کہ ایک اصالتاً معجزہ ہے دوسرا تبعاً ہے۔ یہی بات شرح عقائد میں ہے، عبارت پر غور کیجیے۔

'' وَيَكُوْنُ ذٰلِكَ اَیْ ظُهُوْرُ خَوارِقِ العَادَاتِ مِنَ الْوَلِيِّ " مُعجزةً۔ لِلرَّسُوْلِ الذِیْ ظَهَرَتْ هٰذِهِ الْكَرَامَةُ لِوَاحِدٍ مِنْ اُمتِهِ لِاَنَّهٗ يَظْهَرُ بِهَا اَیْ بِتِلْكَ الكَرَامَةِ اَنَّهٗ وَلِيٌّ... حَتّٰى لَوِادَّعٰى هٰذا الوَلِيُّ الاسْتِقلَالَ بِنَفِسِهٖ وَعَدِمِ المتابعةِ لَمْ يَكُنْ وَلِيًّا وَلَمْ يَظْهَرْ ذٰلِكَ عَلٰى يَدِهٖ۔ وَالْحَاصِلُ اَنَّ الاَمْرَ الخَارِقَ لِلْعَادَةِ فَهُوَ بِالنِسبَةِ اِلَى النَّبِیِّ ﷺ مُعْجِزَةٌ سَوَاءٌ ظَهَرَ مِنْ قِبَلِهٖ اَوْ مِنْ قِبَلِ اَحَادِ اُمَّتِهٖ وَبِالنِسْبَةِ اِلَى الولِی كَرَامَةٌ لِخُلُوِّهٖ عَنْ دَعوی نُبُوَّةٍ ---- ''(شرح عقائد ۱۰۷)۔

اور یہی بات '' شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے بھی '' میزان

العقائد'' میں لکھی ہے جوشرح عقائد کے اخیر میں ملحق ہے۔ '' ثُمَّ الخَارِقُ قَدْ يَظْهَرُ عَلیٰ يَدِ وَلِيٍّ وَهِيَ مُعْجِزَةٌ لِلنَّبِي ۔ صلی اللہ علیہ وسلم (شرح عقائد ۱۴۲)۔شاہ صاحب نے بھی کرامت پر معجزہ کا اطلاق کیا ہے۔

ہم اس کی نظیر بھی پیش کر دیتے ہیں ۔علم قراءت میں ایک ہے قرأت ۔اور دوسری ہے روایت ۔ سات قراء ہیں اور ان کے دو دو شاگرد ہیں یعنی چودہ ۔ ہم لوگ شاگردوں کے واسطوں سے قراء تک اوران کی قراءت تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان شاگردوں سے مروی طریق پر پڑھیں گے جیسے ''امام حفص رحمہ اللہ تعالیٰ'' تو اس میں بھی دو جہتیں ہیں ، جو بھی شاگرد سے مروی روایت پڑھیں گے اس میں اگر پیش نظر راوی ہے تو اس مروی کو''روایت'' کہیں گے اور اگر اسی مروی میں نظر راوی کے بہ جائے قاری ''استاذ'' پر ہے تو''قراءت''بن جاتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی ہیں صرف نظر کے فرق سے روایت اور قراءت کا فرق ہوجاتا ہے۔بس اس طرح ولی کی کرامت میں بھی اگر نظر نبی کی طرف ہو تو وہ ''معجزہ'' ہے اور اگر نظر ولی کی طرف ہو تو وہ کرامت ہے۔۔معلوم ہوا معجزہ نبی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس نبی کے کام کو جو بھی انجام دے اس کے ہاتھ پر بھی معجزہ (کرامت) ظاہر ہوتا ہے جس کام کو کار نبوت کہتے ہیں چاہے پھر دعوت ہو کہ تعلیم دین۔تو بات بالکل درست ہے کہ معجزہ نبوت یعنی نبی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

(۷) اعتراض،خروج فی سبیل اللہ فرائض شرعیہ پر مقدم ہے:

توجیہ نمبر ایک: اس جملہ سے دعوت وتبلیغ کی اہمیت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا ہے یہ از قسم مبالغہ ہے اور مبالغہ درست وجائز ہے۔اس سے مقصود شریعت ودین سے مزاحمت نہیں۔

توجیہ نمبر دو: یہ نہ فی الواقع عقیدہ ومسئلہ کی خبر ہے۔ نہ خلاف شرع انشاء عقیدہ یعنی نہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ شریعت میں ایسا عقیدہ یا مسئلہ ہے اور نہ اپنی جانب سے کوئی نیا عقیدہ بنا کر

لوگوں کواس پر بلانا ہے، بلکہ فی الحال، واقع حال کی خبر دینا ہے یعنی دعوت وتبلیغ کی جد وجہد سے جو فوائد حاصل ہورہے ہیں وہ بتاتا ہے کہ لوگ فرائض اسلام سے انتہائی دور ہیں لیکن جب وہ دعوت وتبلیغ سے جڑ جاتے ہیں تو اب دو چار نہیں سینکڑوں فرائض پر کھڑے ہوتے ہیں لاکھوں لوگ اس کی مثال ہیں، تو مطلب اس وقت لوگوں میں پہلے دعوت آتی ہے پھر فرائض زندہ ہوتے ہیں اس کی خبر دینا ہے توخروج، فرائض شرعیہ پر مقدم ہوا۔ ''لَاتَقُوْمُ الرِجَّالُ بِالفرائِضِ حَتّٰی یَخْرُجُوْفِی سَبِیْلِ اللہِ یَالَاتُؤْتَی الفرائِضُ اِلَّا بَعْدَ الخُرُوْجِ ''۔اب بتائیے کیا غلط ہے!!

توجیہ نمبر تین : اگراس قول کوکوئی تاویل کا جامہ نہ پہنایا جائے اوراسے حقیقت پر ہی رہنے دیا جائے تب بھی کوئی اعتراض نہیں اس کی پوری گنجائش ہے، بایں معنی کہ یہ ابتداء اسلام کے حال کی ترجمانی ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے احکامات نال فرمانا چاہا تو پہلے مفصل سورتیں نازل فرمائیں جن میں جنت وجہنم کا ذکر ہے تاکہ صحابہ کرام کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی پیدا ہوجائے۔۔۔اگر ایسا نہ کیا جاتا اور حکم نازل کردیا جاتا کہ تم شراب نہ پیو تو لوگ کہہ دیتے ہم کبھی بھی شراب چھوڑنے والے نہیں، اسی طرح زنا کا حال۔۔۔خلاصہ یہ کہ پہلے صحابہ کا ایمان بنایا گیا اور انہیں مختلف آزمائش میں ڈالا گیا پھر احکامات عطا کیے گیے تاکہ احکامات چھوڑنے کا مسئلہ ہی پیش نہ آوے (بخاری شریف ۲/۷۴۷)۔تو دیکھیے اس حدیث میں فرائض کا مؤخر ہونا اور اسلام وایمان کے بنانے اور انہیں راہ خدا میں خروج کرانے کا مقدم ہونا معلوم ہوا۔اوریہی بات مرقات میں بھی ہے۔''اِنَّمَا الماءُ مِنَ المَاءِ'' حدیث شریف کے تحت لکھا ہے ''وَلَمْ یُکَلَّفُوْا اَوَّلًا اِلَّا بِالتَّوْحِیْدِ ثُمَّ بَعْدَ مُدَّۃٍ فُرِضَ عَلَیْھِمْ مِنَ الصَّلٰوۃِ ثُمَّ فُرِضَ عَلَیْھِمْ رَمَضَانُ ثُمَّ تَتَابَعَتْ الفَرَائِضُ ''(مرقات ۲/۳۹)۔بالکل بات واضح ہوگئی!

(۸) اعتراض، قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے:

توجیہ نمبر ایک : حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں شرعی فقہی واجب مراد نہیں ہے کہ اعتراض کیا جا سکے، ماقبل کے مباحث پر نظر ڈالیے اس کی کئی مثالیں ہم نے لکھی ہیں، یہ بہ طور تحریض ہے، ''لغوی اور عرفی واجب'' مراد ہے۔

توجیہ نمبر دو : دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں صرف نہ ناظرہ پڑھنے کا معمول تھا نہ حفظاً بلکہ فہم و تدبر اور تقاضۂ آیت پر عمل کرنے کے ساتھ تھا اور چوں کہ اس کام کا نہج سیرت صحابہ پر قائم ہے تو اس نہج پر اٹھانے کے لیے ''ایک جدید تعبیر'' میں واجب کہا ہے۔ چناں چہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا وہ یہ ''فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا'' (الاتقان ۲/۱۷۶)۔ اور موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سورۂ بقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال گزارے اور مسند احمد میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ الِ عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ (الاتقان ۲/۱۷۶۔ نوع ۷۷)۔

یہ تھا صحابہؓ کا حال، کیا امت کو اس پر لانا کوئی گناہ ہے؟ آپ کہیں گے اس پر لانا تو کوئی گناہ نہیں ہے لیکن شرعاً واجب کہنا گناہ ہے!! تو ہم کہیں گے جب ہم نے پہلے ہی کہہ دیا کہ یہ شرعی و اصطلاحی واجب نہیں بلکہ عرفی ہے، تاکیداً ہے، تحریضاً ہے، ایک جدید تعبیر ہے، تو پھر اعتراض کیسے؟ اور اس کے بغیر آپ کر سکتے ہیں تو کر کے بتائیے!! پھر امت کو رسمیت و بے روح و بے جان چھوڑنا اچھا ہے کہ اس طرح کے ہاتھ پیر مارنا اچھا ہے! ذرا سمجھ سے کام لیجیے خواہ مخواہ کوئی کام کر رہا ہے اس میں رکاوٹ نہ ڈالیے! رہا یہ سوال کہ مولانا نے ترک فہم پر نفع کی نفی کی ہے کہ ایسی تلاوت کا کوئی نفع نہیں بلکہ گناہ کا باعث قرار دیا ہے تو یہ کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ

یہ سمجھ کر پڑھنے پر جو نفع واجر حاصل ہوتے ہیں اس کی نفی ہے۔ مطلق تلاوت سے حاصل نفع واجر کی نفی نہیں ہے کہ نفس تلاوت کا بھی اجر نہ ہو۔ ''تَنْفَعُ التِّلَاوَۃُ بِالْفَهْمِ صَاحِبَهَا أَكْثَرُ مِنْ مَحْضِ التِّلَاوَةِ فَلَا تَنْفَعُهُ ذٰلِكَ مَحْضُ التِلَاوَۃِ''۔ اور گناہ کے اطلاق کی تاویل وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں تھی یعنی ''بزعم الدعوت'' کہ اصحاب دعوت کے یہاں سمجھ کر نہ پڑھنے پر گناہ ہے یعنی عرفی گناہ۔ جس طرح اہل تصوف کے یہاں ترک اوراد کا باعث لعنت ہونا۔

(۹) اعتراض، فرشتوں کا اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے اجتماع میں نزول:

توجیہ نمبر ایک: دراصل یہ کیا جملہ ہے؟ ہم نے تو نہیں سنا، سننے سے پوری طرح بات سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تاویلات پیش کر دیتے ہیں۔ کام کے عجیب وغریب تأثرات کے پیش نظر ناممکن تو کیا مستبعد بھی نہیں۔ حیاۃ الصحابہ میں ہزاروں واقعات لکھے ہیں اور آج کے دور میں ملکوتی مخلوق نہ سہی زمینی بہت ساری مخلوقات کے محیّر العقول واقعات اہل تبلیغ کے ساتھ پیش آئے ہیں لہٰذا یہ مستبعد بھی نہیں۔ بلکہ ملکوتی مخلوق کے ماننے پر بھی محمول کر سکتے ہیں کیوں کہ جب ہم اس سے پہلے کرامت معنوی مان چکے ہیں تو کرامت حسّی جو کم رتبہ ہے کیوں نہیں مان سکتے!

توجیہ نمبر دو: مولانا کے اس جملے میں ۳احتمالات ہیں (۱) بلا دیکھے جھوٹ کہہ رہے ہیں (۲) دیکھ کر سچ کہہ رہے ہیں (۳) دیکھ کر یا بن دیکھے سچ اور جھوٹ سے قطع نظر پختہ یقین کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔ پہلے دو احتمال کو چھوڑ دیجیے کیوں کہ ان میں مستدل ومعترض دونوں کے لیے دلیل ہے تو ہر دو پر حجت بھی ہے۔ تیسرے احتمال کو لیتے ہیں۔ پھر اس قول کی گنجائش اور اس کی صحت میں کوئی تردد نہیں کیوں کہ جب اس درجہ کسی کا یقین ہو کہ وہ گویا عین یقین سے دیکھ رہا ہے تو یہ رویت ہی کے درجہ میں ہے۔ امام رازیؒ نے آخرت کی جنت نعیم اور دنیا کی جنت معرفت میں جنت معرفت پر خیر کا اطلاق کیا ہے۔ ''اِنَّ جَنَّةَ الْمَعْرِفَةِ خَيْرٌ مِنْ جَنَّةِ النَّعِيْمِ'' (تفسیر کبیر ۱/۱۷۷)۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ ہماری کتاب (نہج الائمہ فی اصلاح الامہ ۳/ ۸۵) میں ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ آخرت میں جنتی کو جو لطف جنت میں آئے گا اس سے زیادہ دنیا میں عارف کو معرفت والی جنت میں آتا ہے۔ جس کی وجہ یہی پختہ یقین ہے۔ لہٰذا عین یقین سے دیکھ کر فرمایا ہے لہٰذا نہ ناممکن ہے نہ جھوٹ ہے بلکہ ایسا سچ ہے جس پر کوئی تعجب بھی نہیں۔ اسی یقین کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے ''لَوْ خُيِّرْتُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالْمَسْجِدِ لَاخْتَرْتُ الْمَسْجِدَ'' (مرقات ۲/ ۲۱۴)۔

توجیہ نمبر تین : یہ توجیہ نمبر دو کی طرح ہی ہے انداز بدلا ہوا ہے۔ مشاہدہ دو طرح کا ہے۔ ایک حسی دوسرا معنوی۔ یہاں مشاہدہ معنوی سے خبر دی جا رہی ہے کہ فرشتے نازل ہوئے، لہٰذا یہ برحق ہے بلکہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بلند درجہ ہونے کی دلیل ہے۔ ہم اس کی نظیر حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں اجابت اذان کی شہادت سے۔ اجابت اذان میں جب کوئی شخص شہادت دیتا ہے جو ''اشهد ان لا اله الا الله'' میں ہے تو حدیث شریف میں ہے ''دخل الجنة'' بصیغہ ماضی ہے۔ آپ اسے وعدہ خداوندی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن وعدہ کے بجائے اسے خبر مانیں جس کا قرینہ صیغہ ماضی ہے تو نہ صرف اس کا احتمال ہے بلکہ یہی احتمال قوی ہے جس کا مطلب وہ اس جنت میں داخل ہو بھی گیا۔ یہی باتیں شراح نے لکھی ہیں۔ (دیکھیے مشکوۃ پر حاشیہ از مرقات ۲/ ۱۶۲)۔ اب بتائیے کہ دنیا میں رہ کر جنت میں داخل ہونا زیادہ مشکل ہے کہ فرشتوں کا اترنا زیادہ مشکل ہے؟ یہاں علماء نے لکھا ہے کہ خدا کا اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے جو شہادت دی وہ عظیم مشاہدہ سے دی ہے ''مشاہدۂ معنوی'' صرف زبان سے رٹ کر یا کمزور یقین سے نہیں دی ہے معلوم ہوا ''معنوی مشاہدہ'' ایسی چیز ہے کہ اس پر خدا کے خصوصی انعام ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا یہ جملہ ''مشاہدۂ معنوی'' پر محمول ہے''

فلا کذب ولا استحال فتدبر ''۔آسان طریقے سے سمجھیے جب تبلیغی حضرات مجلس منعقد کرتے ہیں تو بیان کے شروع میں کہتے ہیں کہ فرشتوں نے ہماری مجلس کو گھیر رکھا ہے جس طرح یہاں فرشتوں کا نزول قابل تعجب نہیں تو پھر وہاں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

(۱۰) اعتراض، جو مجھے امیر نہ مانے وہ جہنم میں جاوے:

توجیہ نمبر ایک: جب امارت کا نہج ہی درست ہے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا امیر ہونا بھی ایک یقین کے درجہ میں ہے تو پھر یہ جملہ بھی خفیف ہے۔ کیوں کہ امیر کی مخالفت کرنے والے کو تو قتل کرنے کا حکم ہے۔

(←) نیز حدیث شریف میں ہے '' مَن مَاتَ وَلَمۡ یَعۡرِفۡ اِمَامَ زمانِه فَقَدۡ مَاتَ مِیتةً جاهِلِیةً '' (شرح عقائد ۱۱۰ اور نبراس ۳۱۰ الحدیث فی صحیح مسلم عن ابن عمر وفی روایة المسلم مَرۡفُوۡعًا مَن مَاتَ وَلَیۡسَ فِی عُنُقِه بَیۡعةٌ۔۔۔) کہ جو شخص اس حال میں مرے کہ اپنے وقت کے امام ''امیر'' کو جانتا نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ ''ولم یعرف'' کے عموم میں ''ولم یسلم ای لم یعترف'' بھی داخل ہے کیوں کہ معرفت بلا تسلیم تو بلا معرفت سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے، جب ادنیٰ کے لیے جہنم ''موت جاہلیت'' کا حکم ہے تو اعلیٰ کے لیے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے اپنے سے جہنم میں جانے کو نہیں کہا ہے بلکہ اس حدیث شریف سے تنبیہ کی ہے۔ کہ دیکھو اس حدیث کی رو سے تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ (→)

توجیہ نمبر دو: یہ جملہ مخصوص شخص کو اس مخصوص حال میں کہا ہے جب مولانا کو بہت تنگ کیا گیا، جسے معترض نے عموم کے اسلوب میں پیش کیا ہے جو نقل کے لحاظ سے خیانت ہے۔ آدمی طیش میں آکر بسا اوقات زبان سے ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس کی حقیقت مراد نہیں ہوتی سوائے طلاق نکاح اور رجعت''۔

توجیہ نمبر تین: امر کئی معانی کے لیے مستعمل ہے۔ آپ اس کو ''اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ'' کی طرح تہدید، کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کی طرح اباحت اور فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِن مِّثْلِهِ کی طرح تعجیز کسی بھی معنی پر محمول کرلیں۔

توجیہ نمبر چار: ہم اس جملے کو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے واقع میں حقیقت پسند اور حامل دین حقیقی پر ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں یعنی ان میں تکلف وتورع اور تصوف نہیں ہے جیسا کہ حضرت حکیم الامت کا حال تھا ورنہ آدمی علو رتبہ کے لحاظ میں ظاہر میں سب کچھ برداشت کرلیتا ہے لیکن اندرونی طور پر حسد، جذبہ انتقام وغیرہ مفاسد میں مبتلا ہوتا ہے لیکن علو رتبہ کے خلاف بات ظاہر کردی اور باطن کو صاف رکھا۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک موقع پر مشرک کے لیے گالی دینا۔ اور بھی کئی توجیہات ہیں ہم نے اختصاراً اکتفاء کیا ہے۔

(۱۱) اعتراض بغیر حضور قلب کے ذکر الٰہی کرنے والا خطا کار گنہگار رہے۔

توجیہ نمبر ایک: یہ بات غلط نہیں ہے۔ ماقبل میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات نماز کے بارے میں گزر چکے ہیں، اور نماز کو قرآن حکیم نے ذکر فرمایا ہے ''اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ'' شاید حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی مراد ذکر سے نماز ہو تو پھر گنہگار ہونا ظاہر ہے۔ یوں بھی دیکھیے کہ آدمی گناہوں کی وجہ سے خدا سے دور ہوتا ہے (صغریٰ)۔ بعض احادیث میں بعض نمازیوں کی نماز کو خدا سے دوری کا سبب بتایا ہے (کبریٰ) نتیجہ بغیر حضور قلب کے نماز وذکر گناہ ہیں یا کہیے گناہ کا سبب ہیں۔ (⬅) چناں چہ غفلت کے ساتھ ذکر پر تنبیہ کرتے ہوئے حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ اس طرح غفلت سے ذکر کرنا جس طرح سامان بنانے والی مشینیں بے کیف بے حس ہوکر سامان بناتی ہیں بے سود ہے۔ (اصلاحی خطبات) (➡)

یاد رکھیے شریعت نے احکامات کو ان کی ظاہری شکلوں کے ساتھ باطنی مخصوص مقاصد کے تحت عائد کیے ہیں، جب وہ مقاصد ہی حاصل نہ ہوں تو صرف یہ نہیں کے مقاصد سے محرومی ہوتی ہے، یہ بھی تو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ مقاصد کو فراموش کرنے کی کوتاہی کی ہے، بس اس کوتاہی کو گناہ اور خطا تصور کیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ حکم کی ظاہری شکل باقی ہو۔ پھر ان باطنی مقاصد کو بعض دفع اتنی اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ عبادت کی ظاہری شکل پلٹ جاتی ہے یعنی اچھی کو بری اور بری کو اچھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے آیت شریفہ ''لَنْ يَّنَالَ اللهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى '' کے تحت لکھا ہے کہ ''عبادت کی خاص صورتیں اصل مقصود نہیں ''محققین کا رجحان یہی ہے'' بل کہ دل کا اخلاص واطاعت مقصود ہے۔ قربانی میں بھی اور دوسری تمام عبادات میں بھی [1]۔

تفصیل حوالہ سے دیکھ لیں۔ (معارف القرآن ۶/ ۲۶۷)۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول کو اسی نظریہ سے دیکھیں تو بالکل درست نظر آئے گا۔ جس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے۔ ''مَعْصِيَةٌ أُورِثَتْ ذُلًّا وَّاِسْتِحقَارًا خَيْرٌ مِنْ طَاعَةٍ أُورِثَتْ عُجْبًا وَاِستكبَارًا ''۔ (مرقات ۱/ ۱۳۸) کہ ایسا گناہ جو آدمی میں ندامت پیدا کرے اور اس کی نظر میں اس کی اپنی ذات کو ذلیل وحقیر دکھائے وہ اس عبادت ونیکی کے کام سے بہتر ہے جو اس میں عجب وتکبر پیدا کردے۔

توجیہ نمبر دو : یہ جملہ ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ بلند مرتبہ لوگوں کے حق میں ہے، تاکہ بلند مرتبہ

[1] حضرت کے اس جملے کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ عبادت کی خاص صورتیں مقصود نہیں حالاں کہ وہ مقصود ہیں اسی طرح شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی فرمایا ہے کہ ''نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں (اصلاحی خطبات ۱/ ۱۷۴) دراصل موقع ومحل کے لحاظ سے حکم بدل جاتا ہے۔ ورنہ سنگین حکم ہے دیکھیے (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱/ ۳۴۲)۔ فتدبر۔

کے بعد بھی وہ غفلت نہ کر جائیں کیوں کہ بلند مرتبہ کی وجہ سے ادنیٰ غفلت تو دور کی بات نیکی کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی اس اصول پر'' مُبَاحَاتُ العَوَامِّ سَیِّاٰتُ الْاَبْرَارِ وَحَسنَاتُ الْاَبْرارِ سَیِّاٰتُ المقرّبینَ ''۔

(۱۲) اعتراض ،حیاۃ الصحابہ کے علاوہ کتابوں کو پڑھنے سے روکنا:

توجیہ : حیاۃ الصحابہؓ کے مطالعہ کا پابند بنانے میں نہ تو دوسری کتب اسلامیہ کی تنقیص مقصود ہے نہ کلیۃً ممانعت۔ یہ ممانعت کسی حاذق طبیب کی کسی پرہیز کی چیز سے ممانعت کی طرح ہے جو ایک معقول چیز ہے۔حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل ذکر یا قرآن میں لکھا ہے کہ ایک شیخ نے اپنے مرید کو ذکر کی تلقین کی لیکن خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو مراقبہ ومحاسبہ کی تلقین کی اور ذکر سے ممانعت کی پھر کچھ وقت کے بعد قرآن شریف کی تلاوت سے بھی ممانعت کردی جس پر لوگوں کو اعتراض بھی ہوا کہ شیخ نے تو قرآن پڑھنے سے بھی روک دیا لیکن جب دل کی کیفیت حاصل ہوئی اور ذکر وتلاوت کی اجازت دی تو اب حال بدل گیا (فضائل اعمال) تو قرآن سے ممانعت کی طرح ہے۔لہٰذا حضرت مولانا کا مقصود بھی یہی ہے۔اسے آسان مثال میں مدارس کے نظام سے سمجھا جاسکتا ہے ہمیں بتایئے کہ کوئی طالب علم یا استاذ تعلیمی اوقات میں مقررہ کتاب کو چھوڑ کر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہے تو کیا یہ درست ہے؟ یہاں قرآن کی تلاوت سے ممانعت کا جو مقصد ہے وہی وہاں بھی ہے۔

تعجب ہے لوگوں کی سمجھ پر کہ اگر اپنے ہی شعبے کی کتاب ''فضائل اعمال'' پڑھنے کو کہیں تو اعتراض کہ دوسری کیوں نہیں؟ اور دوسری کتاب ''منتخب احادیث'' لاتے ہیں تو بھی اعتراض کہ دوسری کیوں لائے؟ اور اپنی سوچ پر ناز بھی کرتے ہیں اور دوسرے کی سوچ پر اعتراض بھی کرتے ہیں!!

(۱۳) اعتراض تکمیل توبہ کے لیے اللہ کے راستہ میں نکلنا شرط ہے

توجیہ نمبر ایک: توبہ کے لیے یہ بات تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی شرط ہے گناہ کو چھوڑنا۔ لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح گناہ کو چھوڑنا ضروری ہے اس طرح دواعی گناہ بھی چھوڑنا ضروری ہے، کیوں کہ دواعی اگر خیر کے ہیں تو انہیں خیر کا اگر شر کے ہیں تو انہیں شر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دواعئ زنا پر زنا کا اطلاق ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آدمی اپنے مقام پر رہ کر جان و مال کو غلط استعمال کے راستے سے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ بھی کسی درجہ میں دواعی گناہ ہوئے تو راہ خدا میں نکلنے سے ان کو چھوڑنا حاصل ہوگا یہ تو نفس تین شرطوں ہی کی بات ہے۔ نفس تین شرطوں پر زائد کا سوال ہی نہیں اٹھتا کیوں کہ دواعی کا حکم تو اصل کے ساتھ ملحق ہے پھر پوری امت یا جمہور کے اتفاق کے خلاف کہاں ہے؟ اس لیے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا یہ کہنا کہ توبہ کی تکمیل کے لیے نقل وحرکت شرط ہے کوئی غلط نہیں۔

چناں چہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی شرح مسلم میں انہی دواعی ذنوب کے چھوڑنے کو درست قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تائب کا ان جگہوں کو چھوڑنا جہاں ذنوب لاحق ہوئے ہیں علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس پر معاون بننے والے دوستوں کو چھوڑنا بھی۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ اہل خیر، علماء حضرات، عبادت گزار متقی اور ان لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جن کی لوگ اقتداء کرتے ہیں اور جن کی صحبت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، ان سب کے ذریعہ توبہ میں تقویت و پختگی پیدا ہوتی ہے۔ (۳۵۹/۲)۔ اور راہ خدا میں یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

توجیہ نمبر دو: الفاظ پر غور کریں تو کوئی خاص اعتراض کی چیز نہیں پائیں گے اس لیے کہ تکمیل توبہ کے لیے ہی تو کہا جا رہا ہے نفس توبہ کے لیے تو نہیں کہا جا رہا ہے، نفس توبہ کے لیے جو تین شرائط ہیں وہ اپنی جگہ ہیں اس سے تو کچھ بھی تعرض نہیں (⬅) یہ ایسا ہی ہے جیسے مشائخ تصوف

کے یہاں تصوف کے اگلے دو درجات طے کرنے کے لیے پہلے تکمیل توبہ کا ضروری ہونا جس کے دو درجے ہیں اجمالی و تفصیلی (اصلاحی خطبات ۹/ ۴۲)۔(➡) نیز تکمیل ایمان کے لیے کچھ چیزیں نفس ایمان کے علاوہ بتائی گئی ہیں، تکمیل جماعت کے لیے بھی کچھ علی حدہ چیزیں بتائی گئی ہیں بس اس طرح یہاں تکمیل کے لیے خروج کو مانیں تو پھر کیا اعتراض ہے؟

(۱۴) اعتراض تنہائی میں گناہ کرنا بے حیائی ہے اور علانیہ گناہ کرنا کوئی بے حیائی نہیں ہے۔

توجیہ نمبر ایک : تنہائی میں مخلوقاتی کوئی مانع نہیں، ہاں اگر وہاں کوئی مانع ہے تو صرف خدا یعنی خالق۔ اور خالق کے سامنے گناہ کرنا ہی بڑی اور اصلی بے حیائی ہے، برخلاف ظاہر کے وہاں مخلوقاتی مانع موجود ہے وہاں اتنی بے حیائی نہیں جتنی تنہائی میں۔

سوال : ظاہر میں بھی خدا ہے جیسے تنہائی میں ہے، پھر آپ کی یہ بات کیسے درست ہے؟

جواب: تنہائی میں صرف خالق ہے جہاں ترجیح کا کوئی سوال نہیں اور ظاہر میں خالق و مخلوق دونوں ہیں لیکن قابل ترجیح مخلوق ہے نہ کہ خالق، کیوں کہ احکام دنیویہ میں ظاہر کا لحاظ ہوتا ہے۔ مثلاً ظاہر میں ستر پوشی خالق و مخلوق دونوں کی حاضری کی وجہ سے ہے لیکن مخلوق کی حاضری کی رعایت راجح ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کے لحاظ سے لباس کا پہننا اور نہ پہننا دونوں برابر ہوتا کیوں کہ اس کے سامنے ستر کا حال لباس میں ایسا ہی ہے جیسا بلا لباس پھر کیوں لباس کا اہتمام کرتے حالاں کہ تنہائی میں بھی لباس صرف اس کے ادب کے لحاظ سے پہنا جاتا ہے اور اسی ادب کی رعایت میں نماز میں ستر پوشی فرض قرار دی گئی ہے ورنہ لباس کا اس کے سامنے کوئی کام نہیں کیوں کہ وہ لباس میں اسی طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح بلا لباس میں۔ (مرقات)

توجیہ نمبر دو: تنہائی کی اہمیت کے خاطر علانیہ کی نفی کی گئی تا کہ اس کی بے حیائی زیادہ ظاہر ہو۔ یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ علانیہ میں بالکل بے حیائی نہیں جیسے ''لا افضل من السکوت شیئ''

(۱۵) اعتراض تمام مسائل کومرکز لے کرآیا کرو:

توجیہ: مسائل سے اگر فقہی مسائل ہوں تو مدارس کے علماء ومفتیان حضرات سے بچا کر مرکز نظام الدین کے علماء ومفتیان کے پاس بلانے کا مقصد یہ ہے کہ ان مسائل کو صرف فقہی رو سے ہی نہیں بلکہ فقہی اور دعوتی وسیرتی دونوں کی روشنی میں حل کیے جائیں تا کہ گنجائش کی حد تک جاسکیں کیوں کہ تبلیغی کام اس طرح حکمت سے کیا جاتا ہے کہ جس سے ناقص الایمان لوگ کامل الایمان بنیں جس کے لیے بعض دفع ظاہری شریعت بھی چھوڑنی ہوتی ہے، حقیقی اور پوری شریعت زندہ کرنے کے لیے جسکی دسیوں مثالیں ہمارے تجربہ میں ہیں بلکہ تبلیغی تمام علماء ومفتیان کے علم میں بھی ہوتی ہیں ،مثلاً کمزور شخص کو قرضہ لے کر آمادہ کرنا ،ایک سال تک بیوی سے جدائی بلکہ حسب موقع شرابی کو مسجد لانا وغیرہ۔ لیکن یہ دوسرے کے ایمان کے خاطر برداشت کرلیا جاتا ہے ۔ سمجھیے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کی طرح ۔ یعنی علم تشریعی وعلم تکوینی وہاں دونوں کا مشرب علی حدہ علی حدہ تھا، وہ امت محمدیہ کے تفوق کی وجہ سے ایک ہی شخص میں مجتمع ہے۔ ماشاءاللہ۔ اور کیوں نہ ہوسکتا جب کہ شریعت کا اعتقادی اصول صرف ادب کی وجہ سے نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ مثلاً اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر وشر دونوں کا خالق ہے، لیکن شر کی نسبت بہ جائے خدا کے ادباً شیطان کی طرف کردی جاتی ہے۔(علم عقائد) تو پھر ایک نامسلمان کو مسلمان بنانے کے لیے وقتی طور پر شریعت کو اس لیے نظر انداز کیا جائے کہ خود شریعت زندہ ہو کون سی قباحت کی چیز ہے۔ کیوں کہ ایمان شریعت سے مقدم ہے۔ جیسا کہ ہم نے علوم ظاہرہ وعلوم باطنہ میں تفصیل کی ہے۔ اور اگر مسائل سے ''امور وحالات'' مراد ہوں جو خروج کے لیے مانع ہوں تو پھر کوئی اعتراض ہی نہیں۔

(۱۶) دعوت وتبلیغ کی چھ صفات مکمل دین ہیں:

توجیہ نمبرایک : ہم تو یہ سمجھتے ہیں چھ بھی زیادہ ہیں اگر یہ کہا جائے کہ صرف دوصفات ''کلمہ ونماز''

پورہ دین ہے تب بھی غلط نہیں۔ کیوں کہ کلمہ میں عقائد اور نماز میں تمام احکام آسکتے ہیں۔ اور دین دو چیزوں کے مجموعے کو کہتے ہیں ایک عقائد دوسری احکامات یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض احادیث میں پیٹ اور شرم گاہ کے گناہ سے بچنے کو یا بعض قرآن کی سورتوں مثلاً سورۂ العصر کو مکمل دین کہا کیوں کہ وہ امہات دین پر مشتمل ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ''امہات دین'' پر ''مکمل دین'' کا اطلاق کیا ہے۔

توجیہ نمبر دو : بعض اہم امور کو لے کر بقیہ سے نظر انداز کرنے کی یہ تعبیر ہے۔ جیسے ہم نے دین وشریعت کے مختصر خاکہ میں قرآن وحدیث کے ذکر نہ ہونے پر کہا تھا۔ صفحہ ۳۳ پر۔

(۱۷) اعتراض مسلمانوں کو چاہیے کہ مشورہ میں حاضر ہونے کا اہتمام نماز سے بھی زیادہ کریں۔

توجیہ نمبر ایک : ہمارے دین اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ لوگوں کو دین کی طرف حکمت سے بلایا جائے '' اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ ۔۔۔'' حضرت مولانا کے یہ الفاظ کس قدر حکمت بھرے ہیں! تب ہی تو تبلیغ نے دنیا کو فتح کیا ہے اور لوگوں کو اعتراض ہے؟ صرف ظاہری الفاظ کو دیکھتے ہیں اندر کی بھری ہوئی بندوق کی گولی کی طرح اس کی طاقت نہیں دیکھتے۔ جب آدمی مشورہ میں آئے گا تو یقیناً نماز پر آئے گا جو عماد الدین ہے اور جب عماد الدین پر آئے گا تو پھر پورے دین پر آئے گا (سبب بول کر مسبب مراد لیا ہے) اب کیا اعتراض؟

توجیہ نمبر دو : نیز نماز پر صراحتاً بلانا اور نماز پر کنایتاً بلانا دونوں میں وزن کنایہ کا زیادہ پڑتا ہے'' اَلْکِنَایَةُ اَبْلَغُ مِنَ الصَّرِیْحِ فِی التَّاثِیْرِ'' یہاں نماز پر بطریق مشورہ ''کنایۃً'' بلایا ہے۔

توجیہ نمبر تین : یہ بھی ہماری شریعت کی تعلیم ہے کہ لوگوں کو دین وایمان پر اس طرح کھڑا کیا جائے کہ کھڑا کرنے کے طریقے سے مخاطب، دین کا انکار نہ کربیٹھے، لہٰذا حضرت مولانا محمد سعد صاحب نماز کی طرف مشورے کے طریق سے بلاتے ہیں تا کہ خدانہ خواستہ کوئی انکار کرے تو

نماز کا انکار لازم نہ آئے۔ جیسا کہ علماء اسلام نے وضو کے بارے میں فرمایا ہے کہ وضو میں فرض پر کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کی دو سنتوں کو مقدم رکھا ہے تا کہ کسی وجہ سے اگر باطل ہو تو سنت ہو فرض باطل نہ ہو۔ دیکھیے کس قدر شریعت کے احکام کی پیروی ہے پھر بھی اعتراض ہے!! یہ ہم نے چند اہم اعتراضات کی توجیہات پیش کی ہیں بقیہ غیر اہم کی توجیہات کو بڑے علماء حضرات پر اعتماد کرتے ہوئے چھوڑ دیا ہے وہ ہمارے مباحث سے از خود سمجھ سکتے ہیں۔

آخر میں سب سے اہم بات

اب ہم چلتے چلتے ایک اہم بات لکھ دیتے ہیں امید ہے کہ بہت نافع ہو۔ ہم ''حق'' اور ''دین'' اس کو نہیں سمجھتے جسے عامۂ لوگ سمجھتے ہیں! ہمارے نزدیک ''حق اور دین'' یہ ہے کہ جس کی طلب میں فی الحقیقت ذرّہ بھر نہ مال کی طلب ہو نہ عزت و مرتبہ کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرماویں ہم ظاہر میں جتنے طالب دین نظر آتے ہیں، اتنے طالب دین نہیں، بلکہ طالب عزت اور طالب مرتبہ ہیں!

ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی طلب عزت میں دین کو بھی نہ چاہیں۔ مثلاً کسی دوسرے شخص (عالم یا غیر عالم) سے واقع میں دین کا فائدہ ہمارے بنسبت زیادہ ہوتا ہو تو اب ہم یہ چاہیں کہ لوگ اسے چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں نہ دین کی پرواہ ہے نہ دین کی طلب ہمیں تو اپنی عزت کی پرواہ ہے کہ لوگ ہم سے دین لیں اس سے نہ لیں تو پھر ہم کیسے اور کتنے بڑے دیندار ہوئے ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ اس مختصر بات کی تفصیل چند صفحات پر آسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے دینی طرزِ عمل کی حقیقت اور اس کی توثیقی نظیریں

بذریعہ سابقہ مضامین ان اعتراضات واحکامات سے ''حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے'' مبرہ ثابت ہونے کے بعد جوان پر ہوئے تھے، اب مناسب ہے کہ حضرت کے دینی ودعوتی طرزِ عمل کی کچھ ایسی حقیقت پیش کی جائے جس سے لوگ انہیں بہ آسانی سمجھ سکیں۔ چناں چہ سابقہ مضامین میں جو مذکور ہیں وہ تو اس حقیقت پر دال ہے ہی مثلاً:

(۱) ان کا ''مشروب بالدعوت ہونا''۔ (فطری اصول)۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا کبھی چھوٹوں سے وہ کام لینا جو بڑوں سے نہ لیا ہو۔ (ملا علی قاریؒ)۔ مزید دیکھیے صفحہ ۱۹۰ پر غلط فہمی کا ازالہ۔

(۳) ایمانیات وتصدیقات میں موثر کلام (بمنزلہ کرامت معنوی)۔

(۴) مولانا میں علمی تفنّن ومعرفتی تنوّع۔

ان سابقہ حقائق کے بعد اب ذیل کے مضامین بھی ملحوظ رکھیے۔ تو ان شاء اللہ ایسی حقیقت واضح ہوگی کہ ان سے جو ایک قسم کی بدظنی قائم ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے۔ ہم ذرا یہ سوچیں کہ ایک طرف حضرت مولانا اتنے بڑے مرتبے پر اتنا بڑا کام کر رہے ہیں!! پھر وہ دین وشریعت کو کیوں چھوڑیں گے وہ اس میں مداخلت کیسے کریں گے! جو ایک نمازی بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس حل کا ایک طریقہ یہ سمجھیے کہ ویسے تو ہر بڑا عالم، دین ومذہب کا شیدائی ہوتا ہے لیکن حضرت مولانا ''دین وامت، شریعت وسنت اور احیاءِ قرآن وحدیث کے انتہائی حریص وشیدائی ہیں۔ اور فرق مراتب تو ایک مسلم اصول ہے۔ جس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو اپنے خاندان سے ملی وراثت اور دوسری ملی فطرت۔جس کے نتیجہ میں اب ان کا طرزِ عمل کچھ جداگانہ مثلاً یہ ہوگا کہ ہر عام وخاص شخص یہ کہے گا کہ ماں باپ کی نافرمانی جائز نہیں ان کی فرمابرداری ضروری ہے۔ یہ بالکل شریعت کے موافق ہے۔لیکن حضرت مولانا فرمائیں گے کہ ''ماں باپ کی فرمابرداری کو چھوڑ و پہلے راہ خدا میں نکلو'' تو ''بظاہر'' یہ جملہ شریعت کے خلاف ہے لیکن اس جملہ کی گہرائی اور اس کی عاقبت پر غور کریں کہ مولانا ایسا کیوں فرماتے ہیں تو معلوم ہوجائے گا مولانا کا منشا دین کو چھوڑ نا نہیں بلکہ اس کے برعکس شریعت کو پورے طور پر زندہ کرنا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ راہ خدا میں نکلنے سے مانع بنیں تو ان کی فرمابرداری چھوڑ واور پہلے راہ خدا میں جاؤ تا کہ خدا کے ہزاروں احکام میں فرمابرداری حاصل ہو۔اور اگر ایک فرمابرداری میں رہو گے تو ہزاروں احکام میں فرمابرداری سے محروم رہو گے۔تو دیکھیے کس قدر ان کا طرزِ عمل درست ہے!! بلکہ راہ خدا میں جانے کے بعد ماں باپ کی فرمابرداری بھی حقیقی معنی میں آئے گی رسمی طور پر نہیں۔ اس طرح غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عام علماء حضرات کی بات اور حضرت مولانا کی بات میں کوئی ٹکراؤ نہیں دونوں صحیح ہیں۔بس طرز جداگانہ ہے۔

(⬅) آپ کو یہ بھی ذہن نشین کرادیں کہ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں علماء آخرت کی تقریباً ۱۲ علامتیں بیان کی ہیں اگر آپ ان علامتوں پر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو پرکھنا چاہیں تو آپ ان علامتوں کو بالتفصیل جلد اول میں ملاحظہ فرمائیں جن میں سے بعض کو انتہائی اختصار کے ساتھ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

(۱) تیسری علامت میں لکھا ہے کہ وہ ایسے علوم کی تحصیل میں مشغول ہوں جو آخرت میں زیادہ کارآمد ہوں یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رغبت کا باعث ہوں۔(احیاء علوم الدین ج اول ۷۰)

(۲) ساتویں علامت میں لکھا ہے کہ علماء آخرت وہ ہیں جن میں علم باطن حاصل

کرنے کی طلب ہو، اور وہ دل کی نگرانی کا، طلب آخرت کا اور اس پر چلنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام رکھیں۔۔۔ یہی چیزیں الہام کی کلید ہیں اور کشف کا منبع ہیں۔ اگر اہل دل کا نور باطن، علم ظاہر پر غالب نہ ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ارشاد نہ فرماتے ''اپنے دل سے فتویٰ لے اگر چہ وہ فتویٰ دیں، اگر چہ وہ فتویٰ دیں اگر چہ وہ فتویٰ دیں''۔ (احیاء ۱/۷۶)

بسا اوقات قرآن کریم کی آیات کے تفسیری نکات اور اسرار و رموز ایسے شخص کے دل میں آجاتے ہیں جو ذکر و فکر میں لگا رہتا ہے یہ اسرار و رموز تفسیروں میں نہیں ملتے، نہ مفسرین کو معلوم ہوتے ہیں بلکہ صرف وہی شخص جانتا ہے جو معرفت کے ارادہ سے دل کی نگرانی میں مصروف ہو، یہ تفسیری معانی اگر مفسرین کے سامنے بیان کیے جائیں تو وہ بھی تصدیق و تحسین کریں اور یہ اعتراف کریں کہ یہ معانی پاکیزہ و مقدس قلوب پر الطاف خداوندی کا پرتو ہیں (احیاء ۱/۷۶)

(۳) آٹھویں علامت میں لکھا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ ''یقین'' کو مضبوط بنانے کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یقین دین کا اصل سرمایہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''اَلیقینُ الایمانُ کلُّه'' اس لحاظ سے یقین کا حاصل کرنا لازم و ضروری ہے۔۔۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا ''تَعلَّمُوا الیَقِینَ'' اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اہل یقین کے پاس بیٹھو، ان سے علم یقین سنو اور ان کی اتباع کرو تا کہ تمہارا یقین بھی ان کے یقین کی طرح پختہ ہو جائے۔ (احیاء ۱/۷۸) پھر اس کے بعد یقین کے متعلقات اور اس کے محل کا تذکرہ ہے جس میں سب سے مقدم توحید ہے۔ اور تبلیغ میں سب سے زیادہ زور اسی پر صرف کیا جاتا ہے۔

(۴) دسویں علامت میں لکھا ہے کہ ان کی گفتگو کا عام موضوع علم و عمل ہوتا ہے۔ عمل کو لغو کرنے والے امور اور دل کو مضطرب کرنے والے امور سے باخبر ''ضرور'' رہتے ہیں تا کہ ان سے اجتناب کیا جا سکے کیوں کہ دین کی اصل ہی شر سے بچنا ہے۔ کیوں کہ فعلی اعمال تو آسان ترین

ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگوں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ لوگوں سے گفتگو کرنے میں سب سے زیادہ انبیاء کے مشابہ تھے اور سیرت وکردار میں صحابہؓ کے مشابہ۔ چناں چہ وہ اپنے مواعظ میں عام طور پر دلوں کے وسوسوں، اعمال کے مفاسد اور نفس کی شہوتوں کے مخفی امور کے متعلق گفتگو کرتے تھے، کسی نے ان سے کہا۔۔۔۔ کسی نے سچ کہا۔ شعر

(۱) راستے تو بہت ہیں لیکن حق کا راستہ جداگانہ ہے — اس راستے کے چلنے والے بھی منفرد ہیں

(۲) نہ کوئی ان کو جانتا ہے اور نہ کوئی ان کے مقاصد سے واقف ہے — چناں چہ وہ آہستہ آہستہ چلے جارہے ہیں

(۳) اور لوگ اپنے مقصد سے غافل ہیں — اور راہ حق کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں

(احیاء ا/ ۸۲)

(۵) گیارہویں علامت : یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور قلب کی صفائی کی بنیاد پر اپنے علوم پر اعتماد کرتے ہیں، محض کتابوں کی بنیاد پر یا سننے کی بنیاد پر اپنے علوم کو قابل اعتماد تصور نہیں کرتے۔۔۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے قبول کے بعد ان کے اسرار بھی سمجھنے چاہیے۔ ان کی گہرائی کا علم وادراک بھی ضروری ہے۔ انہیں سمجھے بغیر یاد کر لینے والا عالم نہیں کہلاتا بلکہ وہ علم کا صرف ''ظرف'' کہلاتا ہے۔۔۔۔ (احیاء ا/ ۸۴) غور کیجیے کیا یہ علامتیں حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب میں نظر نہیں آتیں۔ (➡)

عام غلط فہمی کا ازالہ

عامۃً یہ بھی ہم سے سمجھ کی خطا ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ ہم بڑے کی بات کو بڑی سمجھیں اور چھوٹے کی بات کو ہمیشہ چھوٹی بلکہ غلط سمجھیں۔ یاد رکھیے ہم بڑے علماء حضرات کی قدر ومنزلت پر کوئی حملہ نہیں کر رہے، اگر ہماری بات کا یہ مطلب آپ نکالیں گے تو خدا کے دربار میں آپ

جواب دہ ہوں گے، ہم بھی یہ بات دین کی موافقت میں کہہ رہے ہیں کیوں کہ بعض دفع چھوٹوں کو نہ سمجھنے سے بھی دین چھوٹنے کی صورت بن جاتی ہے اور ہم اس کے ''مقِرّ'' ہیں اور اقرار کرنے والے کا قول معتبر ہوتا ہے اس کو آپ تسلیم نہیں کرتے تو آپ پر جواب دہی لازم ہوگی۔ لہٰذا بعض دفع چھوٹوں کی باتوں پر بھی دھیان دینا ضروری ہوتا ہے۔ ہم اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ان دو مثالوں سے سمجھیے کہ ان میں چھوٹوں سے وہ کام ہوا جو بڑوں سے نہیں ہوا۔

پہلی مثال : علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ان کا مقام علماء حضرات جانتے ہیں تفصیل یہ ہے کہ دو متضاد قول میں جمع و تطبیق نہ صرف ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کی ضرورت قدم قدم پر پیش آتی ہے۔ انہی میں سے ایک وہ جگہ بھی ہے جہاں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسا وہ بڑا عالم۔ جو پتھر کو سونا ثابت کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں تطبیق مشکل ہے۔ حالاں کہ ان کی پوری کتاب تطبیق سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع بھی کوئی تطبیق کی صورت نہ ہو اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ کسی دوسرے عالم کے پاس بھی تطبیق کی صورت نہ ہو۔

وہ مقام یہ ہے کہ ایک طرف علماء اسلام فرماتے ہیں ''اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی'' دوسری طرف علماء اسلام یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''جو شخص بھی خلق قرآن کا قائل ہو یا جنت میں رویت باری کو ممتنع سمجھتا ہو یا شیخین کو سب و شتم کرتا ہو وہ کافر ہے۔ (شرح عقائد ۱۲۲)۔ دیکھیے دونوں قول میں تضاد ہے، جس کی تطبیق ضروری ہے، چناں چہ شراح نے اس کی تین تطبیقات پیش کی ہیں، باوجودیکہ علامہ کو کوئی تطبیق سمجھ نہیں آئی۔ (نبراس ۳۴۲)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کبھی کبھی بڑے کو جو بات سمجھ نہیں آتی وہ چھوٹے کو سمجھ آجاتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ کبھی چھوٹے کی بات میں بھی حق وصداقت ہوتی ہے۔

دوسری مثال: محدثین رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے بڑے عالم

نے سند عالی سند سافل کے تحت لکھی ہے۔ حضرات علماء کرام خصوصاً محدثین جانتے ہیں کہ سند عالی کی طلب محدث کی غایات میں سے ایک ہے۔ یحیی بن معین۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ سے وقت مرض میں پوچھا گیا کہ کوئی چاہت تو فرمایا ''خالی بیت عالی سند'' احمد بن اسلم۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے فرمایا قرب اسناد قرب الی اللہ ہے۔ وغیرہ اسی وجہ سے تمام محدثین: متقدمین ومتأخرین نے علو اسناد میں بڑی دلچسپی لی، حتی کہ متأخرین محدثین نے اس کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ بقول علامہ ابن حجرؒ دین کے اہم امور کو بھی فراموش کر دیا ''وَقَدْ عَظُمتْ رَغْبَةُ الْمُتَاخِّرِيْنَ فِيْهِ حَتّٰى غَلَبَ ذٰلِكَ عَلٰى كَثِيْرٍ مِنهمْ بِحَيْثُ اَهْمَلُوْا الاِشْتِغَالَ بِمَا هُوَاهَمُّ مِنْهُ'' (نزھۃ النظر ۹۵)۔ شراح نے اہم کام کی نشاندہی یہ کی ہے مثلا حفظ واتقان اورعفت واحسان اور اسناد صحیح اور احوال رواۃ کی تحقیق وغیرہ کہ یہ اہم تھے لیکن انہیں فراموش کر دیا۔ (شرح قاری نزھۃ النظر ۱۹۴، ۱۹۵)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض دفع بڑے حضرات سے بھی اہم امور عدم توجہ کے شکار ہو جاتے ہیں اور چھوٹوں کی توجہ اس طرف ہو جاتی ہے۔

مذکورہ دو مثالوں کو ہمارے دعویٰ کی دلیلیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر انکار ہے تو لیجیے اب دو دلیلیں دیدیتے ہیں اسے قبول فرمائیے۔ ایک ابن حجر اور دوسری شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔ کی جانب سے۔ دونوں کا ڈھنگ بھی الگ الگ ہے۔ ایک میں چھوٹے بڑے کا اور دوسرے میں اگلے پچھلے کا ذکر ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ اگلوں نے جو کچھ قرآن وحدیث سے مستنبط کیا ہے وہ صحیح یا راجح ہو، بعد کے علماء کے استنباط بھی صحیح یا راجح ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح لکھا ہے کہ بعض علماء اسلام نے آیات واحادیث کی جو تفصیل وتفسیر کی ہے، ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی تفصیل وتفسیر سے زیادہ قابل قبول ہو، علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور فوق کل علم علیم ایک مسلم حقیقت ہے۔ ترجمانی حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱/ ۱۵۴)۔

ہم نے ماقبل میں جولکھا ہے ''اِنَّ لِکُلِّ اٰیَةٍ سِتُّوْنَ اَلْفَ فَهْمٍ '' اس سے بھی حضرت شاہ صاحب کے قول مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ نیز جب ایک ایک آیت کریمہ کے اتنے سارے مفاہیم ہوسکتے ہیں، جب کے ہمارے علم میں دو چار مفاہیم ہوتے ہیں پھر جدید مفاہیم کا انکار درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے بعض حالات میں شاذ تفسیر کا اور سلف کے خلاف کا اعتراض ختم ہوجاتا ہے۔ اب دوسری دلیل، حافظ ابن حجر کا قول ملا علی قاری۔ رحمہا اللہ تعالیٰ۔ نے نقل کیا ہے آپ تفصیل حوالہ سے پڑھ لیں، حدیث شریف ''اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبَعِضِ بُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ '' کے تحت بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مجتہد دلیل کا پابند ہے اور اس کے لیے دلیل کی وجہ سے پوری گنجائش ہے کہ دوسرے کو خطا پر قرار دے بلکہ اس کی خطا پر قسم اٹھانا چاہے تو اٹھا سکتا ہے چاہے ''خطا کار'' رتبہ میں اس سے بڑا ہو اور علم میں بڑھا ہوا ہو۔ صاف صاف بات ہے جسے سمجھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ چناں چہ مرقات کی فہرست میں اس جگہ عنوان یہ ہے ''اَلْاِخْتِلَافُ مَعَ الْاَكَابِرِ بِالدَّلِيْلِ جَائِزٌ '' (مرقات ۴/۱۰۰)۔

یہ بات دراصل غور وفکر کی ہے لیکن لوگ غور وفکر سے کام نہیں لیتے جس سے جو بات دریافت کرنی چاہیے یعنی پانی چاہیے وہ نہیں پاتے وہ یہ کہ بعض حضرات بڑے ہی حساس ہوتے ہیں اور انتہائی متیقظ ہوتے ہیں جس سے وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اصلاحی ایسی باتیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کا ذکر دیگر بڑے حضرات بھی نہیں کرتے۔ مثلاً حکیم الامت علامہ تھانوی، حضرت قاری صدیق صاحب باندہ اور شاہ ابرار الحق ہردوئی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ وغیرہ جو حضرات ان ہستیوں کو جانتے ہیں وہ ہماری اس بات سے اتفاق ضرور کریں گے۔ وہ حضرات باریک باریک اصلاحی باتیں کہتے بھی ہیں اور تحریر بھی ایسی ہی لاتے ہیں۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا حال بھی ان کی طرح ہے۔ ہم اس کی وضاحت چند نظیروں سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) کوئی عالم دین مثلاً یہ کہے ''بعض معصیتیں ''گناہ'' طاعت ''نیک کام'' سے بہتر ہوتی ہیں۔ یا یہ کہے کہ بعضوں کو'' بیت اللہ'' یعنی مسجد میں بھی خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور بعضوں کو'' بیت الخلاء'' میں بھی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ پہلی بات سے بہت سے عوام بلکہ علماء حضرات بھی بھڑک جائیں گے کہ جو چیزیں شریعت میں طاعت و معصیت ہیں ان میں معصیت، طاعت سے بہتر کیسے ہوسکتی ہے!! اسی طرح دوسری بات میں بھدی تشبیہ سے بھڑک جائیں گے۔ لیکن یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ کیوں کہ جو گناہ آدمی کو شرمندہ بنادے اس نیک عمل سے بہتر ہے جو آدمی میں عجب پیدا کرے۔ (مرقات ۱/ ۱۳۸)۔

(۲) ہم اپنے تجربہ کی مثال دیتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان میں سرفہرست یہ بات ہے کہ'' کلمہ توحید کی شہادت دے'' یہ عوام وخواص اور مکتب سے لے کر ادارے کے آخری درجہ تک یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ کلمہ کی گواہی دینا۔ لیکن کبھی غور کیا کہ یہ ''گواہی یعنی شہادت'' کیا ہوتی ہے؟ ہم نے جب طالب علمی کے زمانہ میں یہ سنا تو سوچنے لگے کہ یہ گواہی کیسی؟ اس کو نہ کوئی مقرر کہتا ہے، نہ کوئی استاذ بتاتا ہے، نہ کوئی مصنف لکھتا ہے اور نہ کوئی ایسا شخص بتاتا ہے جس سے اس کا سوال کیا جائے۔ جب کہ اس کا ذکر بنیادی ارکان میں کیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنے زمانہ تدریس و تعلیم میں ہزاروں کتابوں کے مطالعہ میں بھی صرف ۲/ ۴ مصنفین کو پایا ہے جنہوں نے اس کی حقیقت بیان کی ہے۔ چناں چہ اس ضرورت واہمیت کی بنا پر ہم نے اپنی تالیفات: اولاد کی تربیت میں اسلامی کردار، فن تدریس کے اصول اور نہج الائمہ فی اصلاح الامہ میں اسے بیان کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھے کہ کوئی مقرر، کوئی معلم اور کوئی مصنف اس کو نہ بولتا ہے نہ لکھتا ہے تو ہمیں بھی نہیں لکھنا چاہیے تو تعجب ان کی باتوں پر ہونے کے بہ جائے لکھنے پر کیا جائے تو درست کیا ہے آپ سمجھ لیجیے!! کیوں کہ جب شریعت نے لفظ'' اشھد '' کا استعمال کیا ہے تو اس کی بھی تو خاص وجہ ہوگی جو ہمیں معلوم ہونی چاہیے۔

(۳) یہ بھی ہمارے ذوق کی مثال ہے۔آج ۱۴۴۰ھ مدت عمر ۵۵ سال تک دسیوں مرتبہ اختتام بخاری شریف کی مجالس میں شرکت کا موقع میسر آیا۔ چوں کہ مزاج حقیقت دین کا ہے اور طبیعت میں تحقیق کا عنصر غالب ہے تو ہمیشہ یہ طلب رہتی تھی کہ مشہور مقولہ ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہِ صَحِیْحُ الْبُخَارِیْ '' کی سند معلوم ہوجائے کہ اس کا قائل کون ہے؟ اب تک نہ مشافہتاً جواب مل سکا نہ تحریراً۔ اور نہ مختلف شارحین بخاری شریف نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چناں چہ ''تحفۃ القاری ''محدث جلیل حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم ''ایضاح البخاری'' حضرت مولانا ریاست علی بجنوری۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ میں نفس مقولہ تک کا ذکر ''فی علمنا'' موجود نہیں۔ البتہ ''کشف الباری'' شیخ سلیم اللہ خاں صاحب۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے مقولہ تو ذکر کیا ہے لیکن قائل کی نشاندہی یہاں بھی نہ دارد (کشف الباری ا/۱۷۵)۔ جب کہ مسلم شریف کی شان پر مشتمل مقولہ ''مَا تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ اَصَحُّ مِنْ کِتَابِ مُسْلِمٍ '' کی سند تو خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے کہ وہ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے (نزھۃ النظر ۳۰)۔ لیکن کوشش سے یہ ضرور معلوم ہوسکا کہ شاید قائل حضرت امام بخاری کے شاگرد رشید ''فربری'' رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں کیوں کہ امام بخاریؒ سے ان کے بعد کے محدثین تک بخاری شریف کا سماع متصل سے صرف ان سے ثابت ہے۔ اس طرح کا اشارہ ''عقد الدرر'' میں علامہ آلوسی نے فرمایا ہے۔ (عقد الدرر شرح نزھہ)

خلاصہ یہ کہ اس طرح کی باتوں سے بھڑکنا نہیں چاہیے وہ ظاہر میں چاہے اجنبیت وحشت پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن ان سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ وہ اصلاحی گوشوں کی طرف مشیر بھی ہوتی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے'' عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۔۔ '' اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان '' کَرِهْنَاهُ فِی الْاِبْتِدَاءِ حَمِدْنَا عَلَی الْاِنْتِهَاءِ '' گزر چکا ہے۔ بس حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کا طرز عمل یہی ہے۔

مسلم دستور اور دعوت وتبلیغ کے دو زمانے

کوئی بھی کام چاہے دینی ہو یا دنیوی، انفرادی ہو یا اجتماعی اس میں مضبوطی لانے اور اس میں ترقی حاصل کرنے کے لیے فطری یہ اصول ہے کہ اس کام کو بالتدریج کیا جائے، بلا تدریج نہ مضبوطی حاصل ہوتی ہے نہ اس میں ترقی اور یہی اصول خدا کا بھی دستور ہے۔ چناں چہ اسی دستور پر کائنات کی تخلیق اور قرآن حکیم کی تنزیل پیش آئی باوجودیکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ یک بارگی کائنات کو پیدا فرمادیں اور قرآن حکیم کو ایک ساتھ ایک ہی وقت نازل فرمادیں۔ اس تدریج میں سب سے بڑی چیز جو ملحوظ ہے وہ لوگوں کی ادنی حالت سے اعلی حالت کی طرف ترقی اور ان کی سہولت۔ اسی علت خفیہ کی وجہ سے بعض احکامات شرعیہ بھی اسی تدریج کے اصول پر فرض ہوئے مثلاً شراب کی حرمت وغیرہ۔ اس کی تائید حسّی مثال سے ہوتی ہے۔

حسّی مثال بچہ کا لباس ہے کہ جب اس کا قد چھوٹا ہوتا ہے تو اس کا لباس بھی چھوٹا ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کا قد بڑھتا ہے تو نہ صرف اس کا لباس بڑھتا ہے بلکہ قصداً بڑھایا جاتا ہے۔ یہ ہے ترقی، بس اس وضاحتی تفصیل سے دعوت وتبلیغ کے گذشتہ دو زمانوں کو اور ان کی حالتوں کو سمجھنا اور سمجھانا ہماری غایت ہے اور پھر موجودہ زمانہ دعوت کو اور اس کی حالت کو سمجھنا اس سے بھی بڑی غایت ہے۔ جو مذکورہ چیزوں کو نہ سمجھے وہ دعوت وتبلیغ کی حقیقت وحالت کو بھی سمجھ نہیں پائے گا اور جو ان کو سمجھ لے وہ اس کو بھی سمجھ لے گا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ زمانۂ تبلیغ کی دو حالتیں اور دو قسمیں ہیں۔

پہلی حالت : حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک کی حالت یہ زمانۂ اول ہے۔

دوسری حالت : حضرت مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اس مسند پر آنے تک کی حالت یہ زمانۂ ثانی ہے۔

جو شخص بھی تعمق و تیقظ سے پورے زمانہ تبلیغ پر غور کرے گا اور مذکورہ بالا اصول و دستور کو ملحوظ رکھے گا تو یہ سمجھ لے گا کہ زمانہ اول میں ضرورت ''دعوت و تبلیغ'' کی بنیاد ڈالنے کی اس کے تعارف کی اور اس کی اہمیت ظاہر کرنے کی تھی۔ چناں چہ اس ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے دو شخصیتوں سے وہی کام لیا۔ اس وقت کے ملفوظات ان کے بیانات ان کی فکریں سب ہی اسی سے متعلق تھے۔ یعنی پوری توجہ دعوت پر مرکوز تھی اور ''دین و شریعت'' کے زندہ کرنے پر توجہ ضمنی تھی اور کم تھی، بالفاظ دیگر اول زمانہ میں ''دعوت و تبلیغ'' کی طرف توجہ اصالتاً تھی اور ''دین و شریعت'' کی طرف تبعاً۔

اب چوں کہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے تھے بلکہ اب تو اسے بڑا درجہ بھی دے چکے تھے تو زمانہ ثانی میں ضرورت تھی کہ ''دین و شریعت'' کی طرف توجہ زیادہ ہو اور دعوت و تبلیغ کی طرف کم یعنی ''دین و شریعت'' اصل کے درجے میں ہوں اور تبلیغ تابع کے درجہ میں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسی شخصیتوں کو اٹھایا جو دین و شریعت کو اچھی طرح سمجھا سکیں۔ چناں چہ حضرت مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ تو خاموش مزاج تھے لیکن حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بہ طور خاص یہ کام لیا اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب اور حضرت مولانا احمد صاحب وغیرہ سے بھی۔

کیوں کہ ضرورت ہی اس کی تھی کیوں کہ پہلے زمانہ کی محنت سے بے دین لوگ اٹھ اٹھ کر آرہے تھے ان کی پہلی ضرورت ہی دین تھی نہ کہ تبلیغ۔ چناں چہ یہ کام اپنے تقاضہ کے مطابق ہوا۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب کو اور ان کے بیانات کو جو حضرات جانتے ہیں وہ ہماری بات

سے اتفاق کریں گے۔ حضرت ۳/ ۳ گھنٹے بیانوں میں دین وشریعت کو اور اللہ تعالیٰ کے چھوٹے بڑے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اچھی طرح مثالوں سے سمجھاتے جس سے لوگ دین وشریعت لے کر اٹھتے۔ خلاصہ یہ کہ اول زمانہ میں دعوت کی ضرورت تھی تو انہوں نے دعوت کو کھولا اور پوری توجہ دعوت پر صرف کی اور ثانی زمانہ میں احیاء دین وشریعت کی خاص ضرورت تھی اور دعوت کی کم تو انہوں نے احیاء دین اور احیاء سنت پر خاص توجہ صرف کی۔

اب ایک تیسرا دور حضرت مولانا انعام الحسن کے بعد شروع ہونے والا تھا جو اولاً حضرت مولانا زبیر الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے شروع ہوا اب اس دور میں پھر ضرورت پیش آئی دعوت وتبلیغ کی طرف عود کرنے کی کہ اصالتاً توجہ اس کی طرف کی جائے کیوں کہ اب کام پھیل چکا تھا اور دعوت وتبلیغ کی جدوجہد ہر گھر میں مہمان بن چکی تھی۔ لیکن اب اندیشہ تھا کہ جس کام کے ذریعہ دین وسنت میں جان پڑی تھی ''مرور زمانہ'' سے وہ خود بے جان ہو کر رہ جائے تو دوبارہ ''دعوت وتبلیغ کی طرف نہ صرف توجہ کی ضرورت تھی بلکہ اب زمانہ اول سے بھی زیادہ اہمیت کی ضرورت تھی۔ پہلے سے زیادہ کی ضرورت دو وجہ سے تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اگر زمانۂ اول کے بقدر ہو تو قوت پیدا نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ تو پہلے سے موجود تھی، دوسرے مرحلے میں قوت پہلے مرحلے کے بنسبت زیادہ مطلوب ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ اول زمانہ میں کم افراد کی ضرورت تھی اور اس مرحلے میں ضرورت دنیا کے اکثر مسلمانوں کی تھی۔ مطلب قدیم نہج میں جان ڈالنے کی بھی ضرورت درپیش تھی اور اس میں مزید ترقی کی ضرورت بھی درپیش تھی۔ ان سب وجوہات سے اب اللہ تعالیٰ نے اس طرح تقسیم فرمائی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تو مکمل توجہ صرف دعوت وتبلیغ پر فرماویں اور بقیہ اکابرین دعوت دین وشریعت اور احیاء سنت پر توجہ صرف فرماویں تا کہ اب دونوں کام امت میں رائج ہوں اور کسی پر رسمیت طاری نہ ہو۔ اس معقول دستور کے

تقاضہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہی مشیت خداوندی ہے لہٰذا اب بذریعہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب جو تبلیغ کی اہمیت، اس میں تنقیح وتہذیب اور کچھ تجدید سامنے آرہی ہے وہ اسی دستور کا حصہ ہے۔ اور اسی ترقی کا حصہ ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کا ملفوظ یاد ہوگا کہ مجھ پر اللہ نے جو کام کھولا ہے میں اس کا سوواں حصہ سمجھ سکا ہوں ۔۔۔ یہ بقیہ حصوں کی تکمیل کا ایک حصہ ہے جس سے بھڑکنا نہیں چاہیے۔ (واللہ اعلم)۔

ماقبل کی ''بالتدریج'' کی بات اور اس کی حسّی مثال لباس اور زمانہ تبلیغ کا یہ تیسرا دور اور اس کی تقسیم کے نتیجہ میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے حصے میں ''دعوت وتبلیغ'' کی طرف خصوصی توجہ اور اس میں تنقیح وتجدید اور ترقی وغیرہ کا لازمی نتیجہ ''منتخب احادیث'' کا لانا تھا۔ خود قرآن کا نزول سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ بالتدریج نازل ہوا تو منتخب احادیث کا لانا بھی تدریج کا اور ترقی کا حصہ ہے۔

(←) چند ضروری اضافات

مباحث کتاب میں ضمنی اضافات کے ساتھ علی حدہ کچھ اہم مباحث میں اضافات کی ضرورت محسوس ہوئی جنہیں یہاں یکجا پیش کیا جاتا ہے۔

اعتراض نمبرایک : تفسیر بالرائے اور تحریف کا اعتراض :

حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور وہ قرآن میں تحریف کرتے ہیں اور اس کا جواب مختصراً کتاب میں ۲ / ۳ جگہ آچکا ہے لیکن یہ اہم اعتراض تھا اس کا اب احساس ہوا اس لیے اس کا حق واجب ادا کرنے کے لیے اسے مستقل بیان کیا جاتا ہے۔

سمعی یعنی نقلی دلائل :

جواب : مایہ ناز عالم ''امام غزالیؒ'' نے تفسیر بالرائے کی حقیقت و تفصیل بتاتے ہوئے جو لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ''تفسیر کے بارے میں یہ ''سمجھنا'' کہ کسی آیت کی تفسیر نقل وسماع پر منحصر ہونی چاہیے۔ نہ استنباط درست نہ فہم و سمجھ سے کوئی بات درست۔ ورنہ تفسیر بالرائے کہلائے گی یہ سمجھ غلط ہے۔ ''فَلا یَخلُو اِمَّا اَن یَکونَ المُرادُ بِهِ الِاقتصارَ علی النقلِ والمسمُوعِ وَتَرکِ الاستِنبَاطِ وَالاستِقلَالِ بِالفَهمِ اَوِ المرادُ بهِ اَمرًا اٰخرَ. وباطلٌ قَطعاً اَن یَکُوْنَ المرادُ بِهٖ اَن لَّا یَتکلمَ اَحدٌ فِی القراٰن اِلا بمایَسمعُهٗ ۔۔۔۔ (احیاء علوم الدین ۱/ ۲۹۷ باب الرابع فی فہم القرآن) اما غزالی کے الفاظ میں یہ سمجھ غلط اس لیے ہے کہ اس سمجھ میں یہ شرط ہے کہ وہ تفسیر آں حضرت سے مسموع ہو اور سنداً منقول ہو، جب کہ اس طرح کی تفسیر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف بہت مختصر منقول ہے بلکہ بہت کم آیات میں بھی منقول ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر تو ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ کے اپنی طرف سے پیش کردہ جملہ تفسیری اقوال کو بھی تفسیر بالرائے کہہ کر رد کر دینا چاہیے (جو بکثرت تفسیر فرماتے ہیں) اور انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انہوں نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہی نہیں ''فَامَّا مَا یَقُولُه ابنُ عَباسٍ و ابنُ مَسعودٍ مِن اَنفسِهِم فَینبغی اَن لا یُقبلَ وَیُقالُ هُو تَفسِیرٌ بِالرَّایِ لاَنهُمْ لَمْ یَسمعُوهُ مِن رَسولِ اللهِ ﷺ ۔۔۔''

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کے حق میں دعا فرمائی ''اللّٰهُمَّ فَقِّههُ فِی الدِینِ وَعَلِّمهُ التأویلَ '' (اگر سابقہ سمجھ کے مطابق) تاویل کا بھی قرآن کریم کی طرح مسموع و منقول ہونا ضروری ہو تو اس میں ابن عباس کی تخصیص کے کیا معنی؟ اور ''لَعلِمهُ الَّذِینَ یَستنبِطُونه مِنهُم '' میں اہل علم کے لیے استنباط کو ثابت کیا گیا ہے اور ظاہری بات ہے کہ استنباط مسموعات سے ایک علی حدہ شئی ہے۔ ان مذکورہ دلائل سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تفسیر میں

مسموع ومنقول کی شرط لگانا غلط ہے۔ ہر عالم ''شرع'' کے لیے اپنی فہم وعقل کے ذریعہ معانی کو مستنبط کرنا جائز ہے۔ (احیاء علوم الدین ۱/۲۹۷)

اس کے بعد تفسیر بالرائے۔ جس کی ممانعت ہے۔ کی دو صورتیں بتلائی ہیں۔

الف : کوئی شخص قرآن میں استنباط بعد میں کرتا ہے، پہلے اپنا ایک رجحان/نظریہ کسی خاص معاملہ میں طے کرتا ہے پھر اس رائے اور رجحان کو صحیح قرار دینے کے لیے استنباط کرتا ہے۔ حتی کہ وہ پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کرتا تو وہ نہ قرآن میں غور وتدبر کرتا نہ وہ استنباط کرتا۔ پھر اس کی دو حالتیں ہیں۔

ایک حالت : یہ کہ وہ اس کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے جو مفہوم آیت شریفہ سے اخذ کیا ہے وہ مفہوم اس کا ہے ہی نہیں لیکن وہ اس پر پھر بھی اس لیے مصر ہے تاکہ وہ اپنے حریف کو شکست دے سکے۔ یہ حال اہل بدعت کا ہے۔

دوسری حالت : یہ کہ وہ صرف اتنی بات جانتا ہے کہ آیت کے معانی میں مختلف احتمالات ہیں لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس نے جو معنی مراد لیے ہیں وہ غلط ہیں بس احتمال کی وجہ سے اسے ہی ترجیح دے کر اسے مراد سمجھ رہا ہے۔ یہ دونوں تفسیر بالرائے ہے۔

ب : دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص محض عربی زبان جاننے کی وجہ سے قرآن کی تفسیر کرنے لگ جائے، اسے نہ قرآن کی مسموع تفسیر (ظاہری) معلوم ہو نہ غرائب کا علم ہو اور نہ وہ مبہم ومحرف سے واقف ہو اور نہ حذف واضمار واختصار سے واقف ہو یہ بھی تفسیر بالرائے ہے (ایضا)۔

یہ ہے ممنوع ''تفسیر بالرائے'' جسے دیکھ کر اور سمجھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی بھی عالم دیوبند کے تفسیری اقوال، تفسیر بالرائے ہیں چہ جائے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال۔ لہذا حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ''تفسیر بالرائے کا اعتراض خلاف نقل اتباع

خواہشات کی وجہ سے ہے ورنہ لاعلمی اور کم علمی کی وجہ سے ہے۔ یہ تو امام غزالیؒ کی بات تھی مزید دیکھیے ۱۸۹ پر علمائے آخرت کی ساتویں علامت میں۔

اب آیئے علامہ جلال الدین سیوطی کی خدمت میں جنہوں نے مستقل تفسیر پر اور اصول تفسیر پر بھی سیر حاصل کام کیا ہے۔ انہوں نے ذیل کے علماء اسلام سے بہت طویل ابحاث فرمائی ہیں۔ مثلاً صاحب برہان علامہ زرکشی، امام ماوردی، علامہ بغوی وکواشی، ابن الحدید، ابن ابی الدنیا، ابو حیان اور شیخ تاج الدین صاحب ''لطائف المنن'' وغیرہ۔ ہم طوالت سے احتراز کرنے کے لیے خاص الخاص مباحث پیش کر دیتے ہیں۔

قال البغوی والکواشی : تاویل کہتے ہیں آیت کو اس کے ماقبل و مابعد کے موافق ایسے معنی کی طرف پھیرنے کو جس کی آیت محتمل ہو جو استنباط میں کتاب اللہ وسنت رسول کے مخالف نہ ہو۔ اس طرح کی تفسیر سے علماء کو ممانعت نہیں ہے (الاتقان فی علوم القرآن ۲/ ۲۳۱ مطبوع ابناء مولوی محمد بمبئی طبع رابع) ''غیر مخالفٍ لِکتابٍ والسنۃِ من طریقِ الاستِنباطِ غیرُ محظورٍ علی العُلماءِ بالتفسِیرِ''۔

وقال ابوحیان : ذھبَ بعضُ مَن عَاصرناہُ اِلی ان عِلمَ التفسِیرِ مُضطرٌّ اِلی النقل فی فَھمِ مَعانِی ترکیبِہ بِالاسنادِ الیٰ مجاھد وطاوس وعکرمۃ واَضرابِھِم۔ وان فَھمَ الآیاتِ یَتوقفُ عَلَی ذٰلِکَ، قَال وَلَیْسَ کذٰلك'' (۲/ ۲۳۴)۔

صاف معلوم ہو گیا کہ علم تفسیر کا نقل پر منحصر ہونے کا خیال غلط ہے۔ جب ابو حیان کے زمانہ میں ایسے خیالات کے لوگ تھے تو آج کے دور میں ہوتو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وقال ابن الحدید : '' اِعلَم اَنَّ معرفۃَ الفصیحِ والاَفصحِ مِن الکلامِ اَمرٌ لایُدرِكُ اِلا بِالذوقِ وَلا یمکنُ اقامۃُ الدلیلِ عَلَیۡہِ '' (۱/ ۲۳۱) معلوم ہوا جب

ممارست سے مزاج وذوق بن جائے تو اس ذوق ووجدان سے بھی قرآن کی تفسیر میں کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں۔اس ذوق کو ہم نے کتاب میں ''مشروب بالشی'' سے صفحہ ۱۱۰ پر بیان کیا ہے۔

قال ابن ابی الدنیا : ''وَعلومُ القرآنِ وما يُستَنبطُهُ مِنهُ بحرٌ لا سَاحِلَ لَه ... واذا فَسر مع حُصولِها لم يكنْ مفسراً بِالرايِ المنهى عنه ... وَلَعلكَ تَسْتَشْكِلُ عِلمَ الموهبةِ وتَقولُ هٰذا شيئٌ لَيسَ فِي قُدرةِ الِانسانِ وليسَ كما ظننتَ۔۔۔(۲/ ۲۴۲)انہوں نے علوم قرآن کو اس قدر وسیع وعریض بتایا ہے جو انسان کی دسترس سے خارج ہے اور ضروری علوم حاصل ہونے کے بعد اخذ کردہ علوم پر تفسیر بالرائے کی نفی کی ہے،اور علم وہبی سے علوم قرآن حاصل ہونے کو ثابت کیا ہے۔

قال فی البرهان : إعلمْ أنه لايحصلُ للناظرِ فهمَ مَعانِي الوحي وَلايَظهر له أسرارُه وفى قلبه بِدعةٌ او كِبرٌ او هَوىً او حُبُ الدنيا أووَهُو مصِرٌّ علَى ذنبٍ او غير مُتحققٍ بِالايمانِ او ضعيفَ التحقيقِ .. وهٰذه كلُها حجبٌ ومَوانعُ بَعضُهَا اكدُ مِن بعضٍ (ايضا)۔ اس میں قلبی بیماریاں مثلا بدعت، کبر،خواہشات نفسانی، حب دنیا گناہ پر اصرار اور دل میں ایمان کا راسخ نہ ہونا یا کمزور ہونا بتائی ہیں جن میں یہ امراض ہوں انہیں نہ وحی کے معانی سمجھ آتے ہیں اور نہ ان کے لیے اسرار قرآن کا اظہار ہوتا ہے۔لیکن اگر جلاء قلب حاصل ہو تو اس پر ان کا ورود ہوتا ہے۔

دیکھیے یہ اقتباسات آپ کے سامنے ہیں۔جہاں مفسر کے لیے ۱۵ قسم کے علوم کے حاصل ہونے کی شرط لگائی ہے اور ان شرائط کا ذکر بھی ہے۔لیکن اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ تفسیر کے لیے یہ ضروری ہو کہ اسے کسی مفسر کی تفسیر سے ہی لیا گیا ہو ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہوگی۔ یہ خیال انتہائی ناسمجھی اور کم علمی پر مبنی ہے۔بلکہ مذکورہ اقتباسات سے یہ معلوم ہوا کہ وہ تفسیر صرف

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مخالف (ٹکرانا) نہ ہو۔ یعنی تضاد نہ ہو اور جو تفسیر کسی طرح بھی میل کھا جائے اور مخالف شرع نہ ہو تو وہ معتبر و مقبول ہے۔

عقلی دلائل :

یہ دلائل نقلیہ کی تفصیل تھی۔ اب عقلی دلیل بھی سمجھ لیجیے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہر تفسیری بات کا کسی مفسر کی تفسیر سے ماخوذ ہونا شرط ہے تو اس میں عقلی تین خرابیاں لازم آئیں گی۔

پہلی خرابی : ہم نے کتاب میں ''علوم اسلامیہ کی وسعت و گہرائی'' میں بیان کیا تھا، ''قَال بعضُ العُلماءِ لِکلِ اٰیۃٍ ستُّونَ الفَ فَھْمٍ '' اس طرح دیگر کئی اقوال ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن بے پناہ علوم کا سمندر ہے جو درحقیقت انسانی دسترس سے بالاتر ہے۔ اگر کسی تفسیر سے لینے کی شرط قرار دی جائے تو اس کے غیر محصور، غیر محدود علوم کو محصور و محدود قرار دینا لازم آئے گا جو قرآن کی شان میں ایک طرح کا نقص ہے کیوں کہ قرآن ایک آفاقی اور ابدی کتاب ہے اور اس کی اس صفت اعجاز میں عیب ہے جو قرآن کا خاص عنصر ہے۔

دوسری خرابی : اگر اس شرط کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس مفسر پر بھی یہ شرط ہوگی کہ وہ اپنی تفسیر کسی مفسر کی تفسیر سے لے، پھر اس دوسرے مفسر پر بھی یہ شرط ہوگی کہ وہ کسی مفسر کی تفسیر سے لے ھکذا الا الی نہایہ کیوں کہ غیر معصوم ہونے میں سب ہی برابر ہیں۔ ''نَحنُ رِجالٌ وَھُمْ رِجَالٌ'' جس سے تسلسل محال لازم آئے گا۔ اور جو بات محال کو مستلزم ہو وہ خود محال۔

تیسری خرابی : جب ہر مفسر کے لیے متقدم مفسر کی تفسیر سے لینے کی شرط ہوگی تو تفسیر کا تعدد و تنوع ختم ہو جائے گا پھر اتنی ساری تفسیری کتب کی کیا ضرورت ہر تفسیر میں بات تو ایک ہی ہوگی، یہ تعدد اس قول کو باطل قرار دیتا ہے۔

یہ عقلی ونقلی دلائل تو اضافے کے ہیں جب کہ ہم کتاب میں شاہ ولی اللہؒ کے اقوال بھی صفحہ ۱۹۲ پر بیان کر چکے ہیں جنہیں ہم اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام غزالی، علامہ سیوطی اور شاہ ولی اللہ کی کتابوں سے دسیوں علمائے اسلام کے اقوال سے نقلی طور پر یہ ثابت ہو چکا کہ کسی کی بات کے صحیح ہونے کے لیے کسی تفسیر میں ہونے کی شرط لگانا غلط ہے اور عقلی طور پر بھی غلط ہے تو پھر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر یہ اعتراض کہ وہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں بالکل بے بنیاد ہے۔ اور جب تفسیر بالرائے کی نفی ہوگئی تو تحریف کا اعتراض بھی ختم ہوگیا جو تقریباً دونوں لازم ملزوم ہیں، ہمیں صرف اتنی ہی بات مطلوب نہیں کہ معترضین ہماری اس بات کو تسلیم کرلیں کہ واقع میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی باتیں درست ہیں بلکہ ہمیں یہ مطلوب ہے کہ لوگ حقیقی معنی میں علوم قرآنیہ سے آراستہ ہوں تاکہ ان کے لیے مزید ہدایت کی راہیں کھلیں۔

خلافِ جمہور کا اور طریقۂ اسلاف سے منحرف ہونے کا دعویٰ

بہت سے حضرات حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ جمہور کے خلاف باتیں کہتے ہیں اور ان کا طریقہ طریقۂ اسلاف سے منحرف بھی ہے۔ تو یاد رکھیے اگر آپ یہ اعتراض اٹھائیں گے تو ہمارے مدارس (کے اپنے طرزِ عمل) پر وہی اعتراض عود کر کے آئے گا اور اس کے معترض کوئی چھوٹا عالم نہیں بلکہ "امام غزالیؒ" ہوں گے۔ کیوں کہ انہوں نے قرنِ اول اور اس کے بعد کے زمانہ میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پانچ اچھے نام (الفاظ) کا جو اطلاق اپنے معانی پر قرنِ اول میں ہوتا تھا۔

اسے بعد کے زمانہ کے لوگوں نے انہی الفاظ کو باقی رکھتے ہوئے فاسد معانی میں

تبدیل ''تحریف'' کردیا۔ یہ ہے تحریف کا الزام اور خلاف جمہور کا الزام۔ وہ پانچ نام (الفاظ) یہ ہیں فقہ، علم، توحید، ذکر وتذکیر اور حکمت۔ '' اِعلَمْ اَنَّ مَنشأَ اِلتِباسِ العُلومِ المَذمومَةِ بِالعلومِ الشرعِیةِ تَحریفُ الاَسامِیِ المَحمودةِ وَتَبدیلُها وَنَقلُها بِالاغراضِ الفاسِدةِ اِلی مَعانٍ غَیْرِ مَااَرادَہ السلفُ الصالحُ والقرنُ الاولُ وَھِیَ خمسةُ الفاظٍ ۔۔ (احیاء علوم الدین ۱/ ۳۸ بیان مابدل من الفاظ العلوم)۔

چناں چہ وہ فقہ کے معنی میں تحریف کا الزام عائد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعد کے لوگوں نے اس میں تخصیص کردی بایں معنی کہ ''فقہ'' کو عجیب وغریب جزئیات اور فتاوی کے ساتھ خاص کردیا کہ فقہ کا معنی ہیں کہ اس کی دقیق علتوں کو معلوم کیا جائے، اس میں خوب کلام کیا جائے اور انہیں اچھی طرح یاد کیا جائے لہٰذا ''بڑا فقیہ'' وہ ہوگا جو مذکورہ چیزوں میں زیادہ غور وفکر رکھے اور اس کا خوب مشغلہ رکھے۔ (جو واقع میں آج ہو رہا ہے) حالاں کہ قرن اول میں لفظ ''فقہ'' کا اطلاق علم آخرت اور اس کی باریکیوں، نفس کی خرابیوں اور اعمال فاسدہ، اور پورے طور پر دنیا کی حقارت اور آخرت کی نعمتوں اور دل میں خوف خدا کے غلبہ کے علم پر کیا جاتا تھا۔ پھر دلیل بیان کی ہے۔

'' لِیَتفقَّھُوا فِی الدِینِ وَلِیُنذِرُوا قَومَھُمْ اِذَا رَجعُوا اِلَیْھِمْ '' امام غزالیؒ فرماتے ہیں آیت سے معلوم ہوا کہ فقہ سے انزار وتخویف حاصل ہوتی ہے۔ جس فقہ سے یہ تخویف حاصل ہوتی ہے وہ تو قرن اول والا فقہ ہے۔ طلاق، عتاق، لعان، سلم، اجارہ وغیرہ کے ''فقہ'' سے تھوڑا انا انذار حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس پر مداومت سے تو دل سخت بھی ہو جاتا ہے اور خشیت الٰہی بھی ختم ہوجاتی ہے جیسا کہ آج خالص فقہ والوں کا حال ہم دیکھ رہے ہیں۔ ''یَقسِی القلبُ وَیَنزِعُ الخشیةُ مِنه کمَا نشاھِدُ الانَ مِن المُتجَرِّدِین له ۔۔'' (حوالہ بالا)۔ جس کو کہیں تنگ نظری آجاتی ہے۔'' فما کان جوابکم وھو جوابنا '' اور ماقبل میں یہ بات امام

غزالیؒ ہی کے حوالے سے بیان کی جاچکی ہے کہ جو باتیں متقدم تفاسیر میں نہ ہوں اور اپنی شرائط کے ساتھ ہوں تو وہ درست ہیں پھر خلاف جمہور کا اور انحراف کا سوال ہی کہاں؟

خلاصہ یہ کہ کوئی بھی الزام عائد کرنے سے پہلے مکمل تحقیق کر لینی چاہیے کہ واقع میں یہ الزام درست ہے یا نہیں ورنہ لوگوں کا علماء پر سے ''اعتماد'' ختم ہو جائے گا کہ کچھ علماء یہ کہہ رہے ہیں اور کچھ علماء وہ کہہ رہے ہیں پھر عوام کس پر اعتماد کریں۔ ''اللھم اھدنا الصراط المستقیم''۔

تاویلات پر شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آپ نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تاویلات کی ہے یہ درست معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ اس طرح تاویلات تو غیر اہل السنہ حتی کہ قادیانی حضرات بھی کریں گے تو کیا وہ صواب پر ہو جائیں گے؟ معلوم ہوا تاویلات کا کام درست نہیں۔

چند جوابات

پہلا جواب : آپ نے تاویل کے دروازہ کو قادیانی کی تاویل کی گنجائش کے راستے بند کر دیا تو آپ کو معلوم نہیں آپ کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ''بارش سے بھاگے تو پر نالے کے نیچے کھڑے ہو گیے'' جس کی تفصیل قدرے فاصلہ پر ہے۔ ابھی آپ سے ہمارا سوال ہے کہ کیا تاویل بالکل ہی جائز نہیں (درست اور نادرست دونوں ہی) یا جائز بھی ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو دلیل انتفاء پیش کیجیے۔ جب کہ ہمارے پاس جواز تاویل کی دلیل موجود ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے لیے اس کی دعا فرمائی ہے ''اَللّٰھُمَّ فقِّھهُ فِي

الدينِ وَعَلِمّه التأويلَ ''(احیاء علوم الدین ۱؍۲۹۷) کتاب میں دوجگہ گزر چکا ہے ۔ نیز تمام کتب تفاسیر وکتب احادیث تاویلات سے بھرپور ہیں ۔ بلکہ سنن دارمی میں تو امام دارمی نے باب ہی ''باب تاویل حدیث رسول اللہ ﷺ'' قائم کیا ہے (دارمی ۱؍۱۱۸) ۔اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر آپ کا شبہ واعتراض غلط ہے۔

رہی آپ کی تشبیہ (قادیانی سے) یہ تشبیہ وتمثیل بے محل ہے کیوں کہ آپ تاویلات حقہ وغیر حقہ کا فرق نہیں سمجھ پارہے ہیں۔اور غیر اہل السنہ کے ساتھ تشبیہ بھی بے محل اس لیے ہے کہ آپ تاویلات بعیدہ وقریبہ کا فرق یا کہیں افراط وتفریط اور اعتدال کے درمیان کا فرق سمجھ نہیں پارہے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ ہماری تاویل، تاویل حق ہے اور تاویل قریب ہے جس کی اجازت ہے جس کا ہم نے تذکرہ شاہ ولی اللہ کے حوالے سے کتاب میں کیا ہے اور اعتدال پر مبنی ہے۔(فافترقا)

اور اگر آپ کا شبہ یہ ہے کہ ہم تاویل تو درست مانتے ہیں لیکن مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال میں تاویل کو نادرست سمجھتے ہیں کسی بڑے عالم کی بات میں تاویل ہو وہ جائز ہے۔تو ہم کہیں گے وجہ تفریق کیا؟ جب کہ غیر معصوم ہونے میں دونوں برابر ہیں ''نحن رجال وھم رجال''۔

دوسرا جواب : کچھ خارجی ایسے امور ہوتے ہیں جن کے تقاضوں سے کسی متکلم کے کلام کی صحت پر بذریعہ تاویل استدلال کیا جاتا ہے جنہیں اصول بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلا متکلم کے عقائد، منصب، فکر ونظر، اسلوب کلام، اور تقاضہ وقت وغیرہ یعنی کسی کے کلام سے اس کے نظر وفکر کو سمجھنا اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کی ترجمانی کرنا اصول بلاغت میں سے ہے۔ بلکہ آج کل تو متکلم کے کلام کے بغیر بھی اس کے ذوق ورجان کو سمجھا جاتا ہے۔مثلا نیٹ پر قابض افسر تنہائی میں نیٹ استعمال کرنے والے اپنے گاہکوں کے رجحان کو سمجھ جاتا ہے کہ وہ کس ذوق کا حامل ہے۔ کیوں کہ ہر آدمی نیٹ سے اپنے ذوق کی چیزیں ہی دیکھتا اور سنتا ہے۔جب

بغیر کلام کے کسی کا ذوق معلوم ہوسکتا ہے تو کلام سے کیوں نہیں؟ تو پھر مولانا کے منصب اور فکر ونظر یعنی دعوت کی وجہ سے ہم کیوں تاویل نہ کرتے جس کی بنیاد یقین کی صحت ہے۔ مثلاً کھانے کی دعا بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے اسے ایک تو عوام سمجھتے ہیں کہ وہ برکت کے لیے ہے۔ اور علماء حضرات سمجھتے ہیں کہ کھانے کو دین بنانے کے لیے ہے کیوں کہ دین کے بغیر برکت بے معنی ہے۔ اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب فرمائیں گے یقین بنانے کے لیے ہے کیوں کہ یقین کے بغیر دین بھی بے معنی ہے۔ یقین اس طرح کہ اگر کھانا خود کا ہے تو یہ احساس ہو کہ یہ اپنی کمائی سے کھا نہیں رہے ہیں جیسے کہاوت ہے "کھانے کے لیے تو کمارہے ہیں" بلکہ یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ کھلا رہے ہیں۔ چناں چہ "اطعمنا وسقانا" کے کلمات بھی یہی بتارہے ہیں۔ اور اگر دعوت کا کھانا ہے تو بھی وہی احساس ہو کہ اللہ ہی کھلا رہے ہیں ہاں داعی نے صرف اس کھانے کا نظم وبندوبست کیا ہے۔ اب ان تینوں فکروں میں کتنا فرق ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔ معلوم ہوا اس طرح تاویل درست ہے۔

تیسرا جواب : تاویل کا دروازہ بند کرنا تکفیر کے دروازہ کو کھولنے کے ہم معنی ہوگا۔ جس کا تذکرہ کتاب میں موجود ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب "علمائے دیوبند" نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر ایک واضح موقف کا اظہار کیا ہے پھر اس کے خلاف مولانا کے اقوال پر اعتراضات کا ازالہ کیسے درست ہے؟

چند جوابات

تو ہم اس شبہ کو تین طرح سے دور کریں گے۔ لیکن پہلے یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ

یہ اور اس طرح کے دیگر شبہات کا علمی حلقے میں کوئی وزن نہیں ہوتا ''یہ کمثل العنکبوت'' ہے کیوں کہ بات دلائل کی ہوتی ہے قول یا قائل کی نہیں۔

پہلا جواب : جوالزامی ہے۔ہمیں بتایئے کہ آپ اور ہم (علمائے دیوبند) رجال دین کے مذکورہ اقوال وغیرہ میں کیوں تاویلات کرتے ہیں جب کہ اس بارے میں واضح موقف تو یہی ہے کہ وہ بین خلاف شرع ہیں؟ ''فَمَا کَانَ جوابُکم وَھُو جَوابُنا''۔

دوسرا جواب : ازالہ درست ہے اختلاف جہت نظر سے اور یہ اختلاف دلائل کی بنیاد پر درست ہے ہاں مخالفت درست نہیں (کما قال ابنُ مَسعُودٍ ﷺ : اَلخلافُ شرٌّ والاختِلافُ (فِی النظرِ) لَیْسَ بِشَرٍّ)۔مطلب جب جہت نظر بدل جائے تو پھر اس کی گنجائش ہوتی ہے۔جس میں کسی کے چھوٹے اور بڑے ہونے کا لحاظ نہیں ہوتا، لحاظ صرف دلائل کی پختگی کا ہوتا ہے۔ہمیں بتایئے کہ کیا آپ احناف کا مسلک یہ کہہ کر ثابت کرتے ہیں کہ ''یہ احناف کا مسلک ہے بس اس میں کسی کو کوئی کلام کی گنجائش نہیں یا دلائل کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں! صحابہ کرام، تابعین عظام اور علمائے مجتہدین وغیرہ میں ایک دوسرے کا رد جو واقع ہے وہ اس کی دلیل ہے جس میں کسی کے چھوٹے بڑے ہونے کا کوئی لحاظ نہیں، لحاظ صرف طلب صواب کا ہے۔چناں چہ خود صحابہؓ کا آپس میں ایک دوسرے کا سینکڑوں امور ومسائل میں تخطیہ (غلط بتانا) ثابت ہے دیکھیے (نبراس صفحہ ۵۵۳ وشرح عقائد صفحہ ۱۲۵)

تیسرا جواب : ہم معترض سے پوچھیں گے کہ تمہارے قول میں ''علمائے دیوبند'' سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد فی الحال احاطۂ دارالعلوم دیوبند کے علماء حضرات ہیں تو یہ تعریف صدق کلی نہیں جسے سب علماء جانتے ہیں اور اگر مسلک دیوبند کے حاملین مراد ہیں تو اس جملہ ''علماء دیوبند'' سے اعتراض میں استدلال تام نہیں کیوں کہ تمام علمائے دیوبند'' مسلک کے معنی میں'' جاری شدہ

موقف وفتویٰ سے متفق نہیں جن میں راقم کتاب بھی شامل ہے تو پھر ازالہ کی گنجائش ہے۔اگر یہ سوال ہو کہ آپ کیوں متفق نہیں تو اس کا جواب تحریر کردہ کتاب کے مباحث ہیں۔

بلکہ ہم پلٹ کر معترض کی یوں گرفت کریں گے کہ آپ خود بتائیے کہ آپ کو دار العلوم سے کس قدر نسبت حاصل ہے؟ شاید اتنی نہیں جتنی راقم کو چاہے ادنی درجہ میں ہی سہی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہی ہاتھوں علمائے دیوبند میں سے ایک عالم کے احوال کو تحریر کرایا ہے دیکھیے کتاب ''علمائے دیوبند کے تابندہ نقوش صفحہ ۱۵۶ از حضرت مولانا قمر عثمانی صاحب دامت برکاتہم استاذ حدیث وقف دار العلوم دیوبند''

درس عبرت برائے مستفتیان

ہم یہاں ذیل میں ان حضرات کی آنکھوں کی پٹی کھولنا چاہیں گے جنہوں نے فتنہ کو ہوا دینے میں بھر پور حصہ لیا ہے چاہے صالح ارادہ سے پرنا سمجھی میں یا ارادہ بد سے اور اس کے لیے انہوں نے طریقۂ کار یا تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کو اعتراضات کا ہدف بنایا یا دار العلوم دیوبند سے فتویٰ طلب کرنا اختیار کیا۔(جیسا کہ ہم نے لکھا ہے طلب فتویٰ غلط قدام تھا) دراصل آنکھوں پر کچھ مخصوص پٹی اس وقت لگ جاتی ہے جب آدمی کے دامن میں جزوی علم ہو اور معلومات کا دائرہ محدود ہو اور عقل وفہم تیز نہ ہو۔اگر علم، دین کے اکثر اجزاء پر محیط ہو اور عقل ونظر تہذیب وتربیت سے آراستہ ہو تو نہ بصارت میں کوئی خرابی پیش آتی ہے نہ بصیرت میں کوئی کمی۔ہم یہاں انہی جیسی صفات کے حامل لوگوں کی عبرت کے لیے۔نہ کہ حقیقت وواقعہ کی نمائندگی کے لیے۔میدان علم ومعرفت کے شہسوار امام غزالیؒ کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔وہ حضرات جو فتوی ہی کو آخری منزل سمجھتے ہیں اور فقہ ہی کو دین وایمان سمجھتے ہیں انہیں امام غزالی کی ان تحقیقات پر غور کرنا چاہیے۔انہوں نے لکھا ہے

''فقہاء دنیا کی نظر فرض عین علوم میں دنیا کی بہتری پر ہوتی ہے اور علمائے آخرت کی نظر آخرت کی بہتری پر'' هٰذا على ضربين : أحدهما يتعلّق بمصالح الدنيا ويحويه كتبُ الفقهِ، وَالمُتكفّلُ بهِ الفقهاءُ وَهُمْ علماءُ الدُّنيا '' (احیاء علوم الدین ۱/۲۳ الباب الثانی) فَإذنْ جميعُ نظر الفقيه مرتبطٌ بِالدُّنيا التي بِها صلاحُ طريقِ الآخرةِ (صفحہ ۲۶)۔امام نے فقہاء کو دنیا کی طرف منسوب کر کے ''علماء دنیا'' فرمایا ہے۔ پھر اس نسبت کی وجہ اور دلیل بیان کی ہے۔المختصر: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ کا تعلق بھی دین سے ہے لیکن براہ راست دین سے نہیں ہے بلکہ دنیا کے واسطے سے ہے، اسی طرح جس طرح علم طب کا تعلق دین سے نہیں، ہاں دنیا کے واسطے سے، اس لیے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دنیا کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہوسکتی'' وَلَعُمري أنه مُتعلِّقٌ أيضاً بِالدِّينِ وَلكنْ لَا بِنفسِهِ بَلْ بِواسطةِ الدُّنيا ''(۱/۲۴)

مثلاً فقیہ اگر کسی کے اسلام کے باب میں کچھ کہے گا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ اس کا اسلام درست ہے یا درست نہیں ہے یا یہ کہے گا کہ مسلمان ہونے کی یہ شرائط ہیں لیکن اس میں بھی وہ صرف زبان پر حکم لگائے گا دل اس کے اختیار سے باہر ہے۔ دلیل یہ حدیث ہے '' هَلّا شَققتَ عَن قلبِه '' اور دوسری مثال نماز کی دی ہے '' وَاما الصَّلاةُ فَالفَقِيهُ يُفتِي بالصحةِ إذَا أتى بِصورةِ الاعمالِ معَ ظاهِرِ الشروطِ وَإن كانَ غافِلًا فِي جميعِ صَلاتهِ مِن أوّلِها الى اٰخرِها '' (ص ۱/۲۵)

امام نے ''مختلف علوم کی طرف لوگوں کا رجحان کیسے ہوا، اس کے اسباب کے ضمن میں'' لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منصب خلافت پر خلفائے راشدین جلوہ افروز ہوئے، یہ لوگ عالم باللہ تھے، فقہی احکام اور فتویٰ میں پوری مہارت رکھتے تھے انہیں فقہاء سے مدد لینے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی، مشورہ کے لیے کبھی کسی کی ضرورت پڑ جاتی اس دور کے

علماء صرف آخرت کے ہو رہے تھے، لیکن بعد میں خلافت ایسے لوگوں کو حاصل ہوگئی جو نا اہل تھے خلافت کے ساتھ امور فتاویٰ کی ذمے داری بھی ان پر رہتی (باوجودیکہ ان میں علمی رسوخ نہ ہوتا) اس طرح انہیں اضطراراً فقہاء کی مدد لینی پڑی۔۔۔ تو پھر علماء اپنی عزت حاصل کرنے کے لیے مختلف علوم کی تحصیل میں مصروف ہوئے تاکہ امراء وحکام سے قرب ونزدیکی حاصل کرسکیں ''فَكَانُوْا لَايَسْتَعِيْنُوْنَ بِالْفُقَهاءِ اِلَّا نَادِرًا ... فَلَمَّا اَفضَتْ الخلافَةُ بعدهُم اِلٰى اقوامٍ تَولَّوهَا بِغَيْرِ اِسْتِحْقَاقٍ وَلَا اسْتِقلَالَ بِعلْمِ الفَتوٰى وَالاحكَامِ اِضْطَرُّوا اِلى الاسْتِعَانَةِ بالفقهاءِ ''(ص ۱/۴۸) امام صاحبؒ کی بات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ مستفتیان کا فقہ ہی کو دین اور وہ بھی دین کامل سمجھنا ایک قسم کا غلو ہے، حضرت نے تو اسے متعلق بالدنیا بتایا ہے بلکہ علم طب کے مثل قرار دیا ہے۔ دوسری یہ کہ علماء باطن کے یہاں بلحاظ اصل فقہاء کی ضرورت نہیں رہتی اگر وہ خود اس علم کے کفیل ہوں۔ پھر طلب فتویٰ پر اس قدر ہنگامہ آرائی کیسے درست ہے؟ لہٰذا جن مستفتیان کا ہم نے کتاب میں ذکر کیا ہے انہیں (نہ کہ اوروں کو) امام کی اس تحقیق سے عبرت لینے کی اور غلو سے باز آنے کی ضرورت ہے۔

خلاصہ موقع ومحل کا لحاظ رکھنا

کتاب کے جملہ مباحث کے بیان کے بعد اور خصوصاً آخری چند اضافوں (تفسیر بالرائے وانحراف، تاویلات اور درس عبرت برائے مستفتیان) کے بعد سب ہی کا خلاصہ پیش خدمت ہے، ہر کسی کے کام اور کلام میں موقع ومحل کی رعایت کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے یعنی جب کوئی مربی، مصلح، حکیم، معلم ومقرر کوئی بات یا کوئی کام کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اس کے مخاطب حضرات ہوتے ہیں ان کی اصلاح وتربیت ملحوظ ہوتی ہے۔ اب جو شخص اس کی شان تربیت اور

اس کے منصب یعنی اس کی نظر وفکر کو نہ سمجھے اس کی رعایت نہ رکھے تو یقیناً وہ اس کے اقوال وافعال کی نہ صحیح ترجمانی کر سکتا ہے اور نہ اس کا صحیح ادراک کر سکتا ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر پوری زندگی کے اقوال وافعال میں اس کی رعایت قدم قدم پر رکھی گئی ہے۔ حتی کہ آپ کے اقوال وافعال کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے منطق، فسلفہ جیسے غیر ضروری علوم کو حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو علماء نے ایک زمانہ میں اس کو بھی لازم قرار دیا۔ اسی وجہ سے جہاں ان افعال واقوال سے علوم ظاہرہ کا اثبات ہے وہاں علوم باطنہ کا بھی۔ اور علوم ظاہرہ کی چار چار شاخیں (مذاہب اربعہ) بھی ثابت ہیں۔ اور حضرات محدثین، مفسرین، فقہاء اور علماء اصولین نے اسی کلام کو اپنے اپنے ذوق کی باتوں پر علیحدہ علیحدہ مستدل بھی بنایا ہے۔ ان کی رعایت اس قدر ہے ان کی سمجھ میں علمائے اسلام میں نمایا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ کوئی کلیات واصول کے سمجھنے میں پیش پیش ہے تو کوئی جزئیات وفروعات کے ادراک میں آگے، کوئی رموز ونکات کی سمجھ میں آگے ہے تو کوئی دلائل کی تحقیق وتدقیق کے ادراک میں آگے ہے لیکن اس کے باوجود کبھی ماہر عالم بھی وہ سمجھ نہیں پاتا جو اس سے کم درجہ والا سمجھ لیتا ہے، ''الجواد قد یعثر'' حتی کہ بعض متأخرین بعض امور کے ادراک میں متقدمین سے پیش رو دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ بعض متأخرین نے بعض ایسی باتیں کہیں کہ اگر متقدمین کے سامنے پیش کی جاتیں تو وہ کہتے یہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے موقع ومحل کی وہ رعایت کی (جو دیگر علماء نے نہیں کی) تو ان کے سامنے ایسی معانی کا انکشاف ہوا جن کا متقدمین کے قلوب پر گزر تو کیا خطرہ بھی نہیں ہوا۔ اور شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے نبی ہیں آپ نے کچھ چیزیں آخری زمانہ کے لحاظ سے ایسی فرمائیں کہ انہیں شروع زمانہ کے لوگ کما حقہ نہیں سمجھ سکیں

کیوں کہ انہیں آخری زمانہ کے پس منظر میں کہا گیا ہے۔ جب کہ آخری زمانہ کے علماء نے اسے بآسانی سمجھ لیا۔ جب ایک مربی اپنی ۴۰ سالہ عرصۂ زندگی کی رعایت ہی میں کوئی بات کہہ سکتا ہے جب کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تو قیامت تک کے لیے ہیں تو آپ جو فرمائیں گے اس میں پورے زمانہ کی رعایت ہوگی۔ اس کی دو چار مثالیں ملاحظہ ہو۔

یہ وہ مثالیں ہیں جنہیں سمجھنے میں ہمیں خود کو پریشانی لاحق ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ''بواسطہ مطالعہ'' اس کو دور کر دیا اور اس کا حل مل گیا وہ کہاں سے؟ اس کا بیان ذیل میں ہے۔

پہلی مثال : بات یہ ہے کہ فراغت ۱۹۸۶ء کے بعد دوسرے سال کنز الدقائق بندہ کے ذمے تھی جس میں ''البحر الرائق'' کا قریب بالاستیعاب مطالعہ ہوتا تھا۔ نماز کے تشہد میں مسبحہ سے اشارہ کے لیے جو عقد بنایا جاتا ہے اس بارے میں پڑھا تھا کہ اشارہ کے بعد اس عقد کا نقض اور پہلی حالت پر عود اس لیے نہیں کیا جاتا ہے کہ نماز نام ہے ''سکون'' کا نماز اتنی حرکت کی بھی متحمل نہیں لہٰذا اب اس کو اسی عقد کی حالت پر ہی رکھا جائے گا۔ (اللہ اکبر نماز کتنی سکون کی چیز ہے!!)۔

اب اصل مثال کی طرف آتے ہیں کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ جس میں کلیۃ مخلوق سے انقطاع ہے اور خالق سے کلیۃ وصال وانہماک۔ یہ صفت کسی بھی عبادت کی نہیں اسی لیے اس میں مشروع حرکت کے سوا حرکت کی بالکل گنجائش نہیں (جیسا کہ عقد کا بیان ہوا)۔ اسی لیے بعض حضرات کی نماز کی کیفیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ ایسے بے حس وحرکت نماز پڑھتے تھے کہ پرندے بھی درخت سمجھ کر ان پر بیٹھ جاتے تھے۔ دوسری طرف احادیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوامامہ کو نماز میں اٹھا لیتے تھے اور نیچے اتار بھی دیتے تھے اور بچوں کے رونے کی آواز آتی تھی تو نماز کو مختصر کر دیتے تھے۔

یہاں اس کی بحث نہیں کی عمل کثیر تھا کہ نہیں یہاں تو سوال یہ ہے کہ جس نماز کی شان ایسی ہے کہ اس میں مخلوق کی طرف التفات کی ذرا بھی گنجائش نہیں پھر نبی کی توجہ اس طرف کیسے؟ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ایک بات ایسی لکھی ہے جس سے اس کا حل نکل آیا۔ اگرچہ حضرت نے یہ مثال تو پیش نہیں کی ہے مثال تو دوسری ہے لیکن وہ یہاں بھی کام دے جاتی ہے۔ بات حضرت حکیم الامت کی بیان کردہ ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ جو ذات ایسی ہو کہ اس پر خدا کی وحی آتی ہے، ملائکہ نازل ہوتے ہیں، ہم کلامی کا شرف حاصل ہے اور ہر آن اللہ تعالی سے رابطہ قائم ہے وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ دل لگی کیسے کر لیتے ہیں وہ ان سے دنیا کی باتیں کیسے کر لیتے ہیں حتی کہ حضرت عائشہؓ کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں کہ گیارہ عورتیں تھیں جنہوں نے معاہدہ کیا تھا کہ ہر عورت اپنے شوہر کی کیفیت بیان کرے کہ اس کا شوہر کیسا ہے۔۔۔ (واقعہ شمائل ترمذی میں ہے)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمہ وقت خدا کی حضوری میں ہوتے ہوئے اہل وعیال کے ساتھ دل لگی فرماویں، یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن اب الحمد للہ سمجھ میں آگئی کہ یہ دونوں باتیں جمع ہوسکتی ہیں اس طرح کہ وہ دل لگی اور ہنسی مذاق بھی درحقیقت اللہ تعالی کے لیے ہورہی ہے، کیوں کہ دل میں یہ خیال ہے کہ مجھ پر اللہ تعالی نے ان کا یہ حق واجب کیا ہے کہ ان کا دل خوش کروں۔ لہٰذا یہ بات ممکن ہے کہ اللہ تعالی کے ساتھ رابطہ بھی قائم رہے اور دل لگی کی وجہ سے وہ رابطہ نہ ٹوٹے نہ کمزور ہو بلکہ اور زیادہ مضبوط ہو (اصلاحی خطبات ۴/۱۱۱ بعنوان حضور کی شانِ جامعیت)

جس طرح یہ رابطہ یہاں نہیں ٹوٹتا بس اسی طرح نماز والی ہماری مثال میں بھی نہیں

ٹوٹے گا تو حل نکل آیا لیکن اس پر نماز والی مثال کو قیاس کرنا تھوڑا سا بعید ہے۔ لیکن ایک بات ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ حضرت حکیم الامت کی مثال کے بمقابل حضرت مفتی صاحب کا عنوان بڑا دل چسپ ہے۔ چناں چہ ہماری نگاہ سب سے پہلے تو اسی عنوان کی طرف اٹھی تھی پھر جب پڑھا تو ہماری سوچ ہماری پریشانی کی مثال اور اس کا حل تھا۔ ہماری نظر اس عنوان پر اسی لیے اٹھی کہ ہم نے اپنی کتاب ''نہج الائمہ فی اصلاح الامہ'' میں منصب امامت سے مختلف کام انجام دینے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جوامع الکلم عطا کرنے کے ساتھ آپ کی ذات کو جامع الافعال بھی کہا ہے اور دلیل کتاب کے مباحث ہیں (باوجودیکہ اب تک کسی کتاب وخطاب میں جامع الافعال نہیں پایا ہے) لیکن حضرت کے عنوان سے ہمارے لیے دلیل نکلتی ہے چاہے الفاظ میں فرق ہے لیکن مقصود تو ایک ہی ہے (فللہ الحمد)

دوسری مثال : حضرت ابوبکرؓ کا درجہ باتفاق امت تمام امت سے بڑھ کر ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کیا مطلب ''لو کان بعدی نبی لکان عمر'' کہ میرے بعد اگر نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ جب صدیق کا درجہ سب سے بڑا ہے تو پھر یہ کیسے کہ عمر نبی ہوتے؟ تو اللہ کا فضل واحسان کہ اس کا حل بھی مل گیا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بحوالہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نانوتوی اسی خدشہ کا حل اپنے ملفوظات میں پیش کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ تو حضور کے اندر فنا تھے وہ مِن بَعدِی میں داخل ہی نہ تھے، وہ آپ کے غیر تھوڑے ہی تھے وہ تو عین ہو گیے تھے یہ وجہ ہے کہ آپ نے اپنے بعد ان کو مستحق (نبوت) نہیں کیا کیوں کہ وہ تو مَعِی تھے ان کو مِن بعدِی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اور یہی راز ہے اس کا کہ صدیق اکبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمر پریشان ہوئے۔ پریشانی تو بُعد سے ہوتی ہے جو فانی ہو چکتا

ہے وہ بعید نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے۔ (حیرت انگیز واقعات از افادات حکیم الامت ۴۰۳ باب ہفتم اشرف اللطائف)

تیسری مثال : حدیث شریف میں نگاہوں کی حفاظت پر ایمانی حلاوت کی بشارت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا احساس ہمیں نہیں ہوتا تھا یعنی یہ حلاوت کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن چوں کہ ہم دوسری بہت ساری دلی خرابیوں (مثلاً حسد، کینہ، غیبت چغلی، جاسوسی چاپلوسی اور حب دنیا یعنی حب جاہ وحب مال) سے بچنے پر دل میں ایک قسم کی طراوٹ وبشاشت محسوس کرتے تھے (جیسا کہ ہر شخص اپنے اپنے طور پر کچھ خوبیوں کی وجہ سے محسوس کرتا ہے) لیکن حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جو لکھا ہے کہ نگاہ کو بچانے پر حلاوت کا حاصل ہونا اس گناہ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ دیگر گناہوں سے بچنے پر بھی یہ حاصل ہوتی ہے۔ (اصلاحی خطبات ۷/۲۹ ایمان کی حلاوت حاصل کرو) تو فوراً بات سمجھ آ گئی کیوں کہ دوسرے گناہوں کے بارے میں تو تجربہ سا حاصل تھا۔

اسی طرح شہید کا مرتبہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن ہماری نظر جس طرح شہید کے کارنامے اور اس کے فضائل پر تھی اسی طرح حدیث "مَن تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مِأَةِ شَهِيْد" پر بھی تھی اس حدیث کے تقاضے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جس سے بھاری بھاری مجاہدات کی بھٹی میں نفس کو تپنا پڑا اس طرح کی مثالیں تو بہت ساری ہیں جنہیں ہم نے اپنے موقع ومحل پر رکھا۔ اسی طرح شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں" (اصلاحی خطبات ۱/۱۷۴) اور دوسری جگہ سلام وجواب کے الفاظ کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ "شریعت میں الفاظ بھی مقصود ہیں" (اصلاحی خطبات ۶/۱۸۶)۔ دیکھیے کتنا تضاد ہے لیکن جب اس کے موقع ومحل پر کہیں گے تو کوئی خرابی نہیں۔

ان ذکر کردہ مثالوں میں غور کی بات یہ ہے کہ جن جن علماء نے یہ باتیں فرمائیں ہیں انہوں نے ان ارشادات کو ان کے صحیح مواقع اور محال کو پرکھا جس سے انہیں سمجھنے میں جو دقتیں تھیں وہ ختم ہوگئیں جس کی اہمیت پر ہم نے عنوان قائم کیا ہے۔ لہٰذا ہر متکلم کے کلام کو سمجھنے میں بھی اس کا سہارا از حد ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ عوام ہوں کہ عام علماء جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے تو سوائے معدود چند علماء کے اکثر علماء کا کوئی مستقل موقف نہیں ہوتا۔ جس کی تاریخ اسلام میں دو چار نہیں بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن ہاں عرف عام میں جو بات جتنی تیزی سے چلتی ہے یا چلائی جاتی ہے لوگ اسی کشتی میں سوار ہوجاتے ہیں اور وہ بھی وہی سوچتے ہیں وہی بولتے ہیں اور وہی لکھتے ہیں ان کے پاس دو متضاد موقف کو پرکھنے کی اور ان میں صحیح موقف کے تعیین کرنے کی نہ عقل و سمجھ ہوتی ہے اور نہ اس کا صحیح علم ان کے لیے مرجع صرف عرف عام اور لوگوں کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوتا ہے۔

رہے وہ علماء جن کے پاس علم ہونے کی نسبت ہے اور لوگوں کی نظر میں ان کا معیار قائم ہے وہ بھی یا تو صحیح موقف کو جاننے کے باوجود ائیں بائیں کی رعایت میں مصلحت کا سہارا لے کر صحیح بات بتانے سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا علم کے باوجود اس موقع و محل کی سمجھ سے قاصر ہوتے ہیں۔ جس کی اوپر مثالیں بیان ہوئیں۔ اس طرح صحیح موقف امت کے سامنے واضح نہیں ہوتا اور اختلاف برقرار رہتا ہے۔ دلیل اس کی زیر اختلاف مسئلہ میں "مسئلہ امارت ہے" اور ایسی عظیم الشان "تبلیغی محنت" پر اس طرح کا فتویٰ ہے۔ یہ دونوں صحیح موقف کی تعیین کی بین دلیل ہیں یعنی اسلام میں امارت ہی ہے یہ بات پتھر کی لکیر ہے اور تبلیغی جد و جہد فی زماننا ایک مسیحہ ہے پھر ان کے خلاف بات کی کیا گنجائش! لیکن ہائے افسوس!!! چناں چہ دوسری مثال میں

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا موقف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت کیا تھا وہ سب ہی جانتے ہیں اور صحیح موقف کیا ہے وہ بھی سب ہی جانتے ہیں لیکن موقع محل پر منطبق کرنے کی سمجھ وہ ہے جو علامہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمائی۔ لہٰذا کسی بھی اختلافی مسئلہ میں صحیح نظریہ قائم کرنے کے لیے خوب جدوجہد سے اور حق وعدل سے کام لینا چاہئے ورنہ بعد میں کوئی صحیح نظریہ لے کر کھڑا ہوگا اور ماسبق نظریہ کی تردید کرے گا۔ جیسے منصور حلاج کے قول کے بارے میں امام غزالیؒ اور ابن حجرؒ نے ایک نظریہ قائم کیا لیکن متقدمین ومتاخرین کے علوم کے حامل وامین ہمارے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کو رد فرمایا۔ (➡)

خاتمۃ الکتاب

دار العلوم دیوبند کا فتویٰ : قارئین حضرات کے ذہنی تصفیہ کے لیے صراحتاً ہم گزارش کرتے ہیں کہ ازہر الہند دار العلوم دیوبند، اس کے علماء حضرات۔ دامت برکاتہم۔ اور ان کے فتویٰ کا ذکر جابجا موجود ہے، جسے آپ اپنی سمجھ سے ان کی بے ادبی اور توہین نہ سمجھیں، کیوں کہ ہم نے کسی ایک جگہ بھی ''فتویٰ'' کو غلط نہیں کہا، ہاں مسئلہ کی مختلف احتمالاتی صورتوں میں ان کے طرز عمل اور حکمت عملی کے بارے میں کلام کیا ہے، جو کسی طرح ان کی بے ادبی نہیں ہے، بلکہ وہ " كَلِّمُوا النَاسَ عَلَى " قَدْرِ " عُقُوْلِهِمْ " مَنَازِلِهِمْ " کی صورت تھی جس میں '' وَلِلنَّاسِ فِيْمَا يَعْشَقُوْنَ مَذَاهِبُ '' کی توسعات مضمر ہیں۔

ہماری بدقسمتی میں کیا شک اگر ہم ''مقدس ومتبرک'' ہاتھوں رکھی بنیاد کو اور علمی قلعہ کو منہدم کردیں! پھر تو نہ ہم محفوظ رہ سکیں نہ ہماری نسلیں۔ '' اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ ذٰلِكَ '' ہم اس سے قطعاً دل سے خوش نہیں ہیں کہ ہم خود ''اظہار حق وصدق'' کے پردے میں ارادۂ بد سے اس پر

انگلی اٹھائیں، اور نہ کوئی دیگر، بلکہ ہمارا یقین ہے کہ ''حضرت مولانا محمد سعد ساحب دامت برکاتہم'' بھی اس سے راضی نہ ہوں گے کہ کوئی ان کی جانب داری میں بھی دار العلوم پر انگلی اٹھائے، بالفرض اگر راضی ہوں تو ہم اس جذبہ کو منکر ومکروہ سمجھیں گے جو بالیقین ان سے متوقع نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان اپنی ماں کے دودھ پینے سے پہلے ہی اپنے دار العلوم سے ''تحنیک'' حاصل کرتے ہیں۔!!

حضرت مولانا محمد سعد صاحب: ہم نے حضرت کے بعض اقوال کے بارے میں صاف لکھا ہے کہ یہ '' بین خلاف شرع'' ہے نہ صرف رجوع کرنا چاہیے بلکہ اسے فرض ولازم قرار دیا ہے، بلکہ اس قول کے ساتھ ادبًا۔ العیاذ باللہ۔ بھی لکھا ہے، کیوں کہ حضرت کے اقوال کی صداقت وصحت تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ''غلط'' قول کو بھی ''عقیدت ومحبت کا رنگ دے کر صحیح تسلیم کرلیں، غلط کو صحیح بتانا خود غلط ہے!! ذہن نشین رکھیے کہ ''حق وصداقت'' کو چھوڑ کر عقیدت ومحبت کی طرف، نسبی رشتوں کی طرف، علاقیت کی طرف اور تعلقات روابط کی طرف جھک جانا ''دین'' نہیں، بے دینی اور بد دینی ہے!! ہم نے ۲۵ دسمبر ۲۰۱۷ء کے بیان ''بذریعہ نیٹ'' سنا بیان میں حضرت نے رجوع فرمایا ہے، بلکہ حضرات علماء دیوبند۔ دامت برکاتہم۔ کے تنبہ پر احسان وتشکر بھی ادا کیا ہے۔ فجزاهم الله جميعاً۔

دراصل عوام کی طرح اکثر علماء حضرات بھی ''علم'' اور ''دین'' کے بارے میں اس قدر حسّاس نہیں جس قدر ان دونوں کا تقاضہ ہے۔ ہم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ دس سالوں سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، ہم چوں کہ ایک بڑے ادارے میں استاذ ہیں اور دعوت سے منسلک بھی ہیں، کتنے ہی لوگوں نے ماضی میں اس کا تذکرہ کیا ہے ہم انہیں جواب میں یہ بھی کہتے تھے کہ حضرت مولانا محمد الیاس اور حضرت مولانا محمد یوسف رحمہما اللہ تعالی۔ کے پچاسوں ملفوظات ایسے ہیں جن سے ان پر اسی طرح اعتراضات

ہو سکتے ہیں جس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر جیسا کہ ہم نے مکاتیب مولانا سعید احمد خان کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ بڑے حضرت جی کی باتوں پر بڑے بڑے علماء کو اشکالات ہوتے تھے۔(ج ۴ صفحہ ۳۲۴) لیکن آج تک ان کے اقوال پر بڑے بڑے علماء حضرات نے بھی اعتراضات نہیں اٹھائے۔ اب آج جو علماء حضرات بھی حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات اٹھاتے ہیں یا تو وہ حضرت مولانا محمد الیاس وحضرت مولانا محمد یوسف رحمہا اللہ تعالیٰ کے ان اقوال کو جانتے ہی نہیں تھے تو یہ ان کے ناقص علم کی دلیل ہے،(لیکن ایسا ممکن ہی نہیں) اور اگر جانتے تھے پھر بھی ان پر اعتراضات نہیں اٹھائے اور مولانا محمد سعد صاحب پر اٹھائے تو یہ ان کے دین کے ناقص ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ یہ ان پر ظلم ہے اور ان سے شاید ''حسد'' ہے۔

اہم بشارت:

دوسری اہم بات یہ کہ ہم نے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ اس کاوش کے آغاز میں خدا تعالیٰ کی کیا کیا تائیدات حاصل رہیں ! اب ہم اختتام پر بھی ایسی ہی اس کی ایک بے پناہ بشارت سنانے بے قرار ہیں ! کہ جوں ہی یہ کتاب اپنے تمام مراحل سے گذر کر دلہن کی طرح سجھنے کے لیے طباعت سے آراستہ ہونے جارہی تھی تو کریم ورحیم مولیٰ نے چاہا کہ اس کے چہرے پر تبسم ومسکراہٹ بھی ہوتا کہ ''نور علی نور'' کا مصداق ہو۔ رفیق محترم نے ایک پیغام دیا کہ ''نیٹ'' پر ایک کتاب ابھی دست یاب ہے'' حضرت جی مولانا محمد سعد پر ہونے والے اعتراضات کا منصفانہ جائزہ'' از حضرت مولانا مفتی ندیم صاحب مدظلہ پاکستانی جسے جستہ جستہ مقامات سے دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا اور بارگاہ الٰہی میں سر بہ سجود ہو گیا۔ کہ ہماری فراست غلط نہیں۔ جس میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ہوئے اعتراضات واقوال کی ''توجیہات وتاویلات'' نہیں بلکہ

حضرت کے اقوال کے مراجع ومصادر ہی پیش کردیے ۔ ماشاءاللہ۔ جب اقوال کے ماخذ کا عظیم کام انجام پاچکا ہو تو اب تاویلات کے راستے ان اقوال کی صداقت بتانے کی خاص ضرورت نہیں رہتی، لیکن چمن کے ہر پھول کے رنگ و بو جدا جدا ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کو چاہنے والی طبیعتیں جدا جدا ہوتی ہیں تو پھر طباعت سے مزین کیا گیا۔ ''ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ''۔

ہماری درخواست ہے کہ عوام وعلماء حضرات ''حق'' بات سمجھنے کے لیے دونوں کتابوں کو بغور پڑھیں۔ اس کتاب میں بہت سارے اقوال میں ''رجوع'' ثابت ہونے کو بھی لکھا گیا ہے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا وہ شجرۂ نسب بھی مذکور ہے جس میں آپ والا ۳۷ واسطوں سے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق۔ رضی اللہ عنہ۔ تک پہنچتے ہیں۔ نیٹ پر حاصل کرنے کی ویب سائٹ۔۔۔۔

اللہ اکبر۔ ابھی تو اوپر کی کتاب کی اطلاع پہنچی ہی تھی اور اسے لکھ ہی رہے تھے کہ عشاء کی نماز کا وقت ہوا تو مسجد میں دو کتابیں رفیق محترم نے ذیل کی تاریخ میں پیش کیں۔ (۱) حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے افکار اقوال سلف کی روشنی میں۔ از مولانا محمد مطیع الرحمن صاحب حیدرآباد، تلنگانہ۔ نام سے ہی کتاب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ (۲) شوریٰ کی حیثیت آثار واسلاف کی تحریرات کی روشنی میں۔ از علامہ محمد اسحاق صاحب اُتاوڑی۔ شاگرد حضرت مفتی اعظم۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی۔ شیخ الحدیث جامعہ عربیہ میوات نوح۔ ہریانہ۔ جب دو ماہ پہلے اپنی تالیف کا آغاز کیا تھا تو ایک قسم کی وحشت تھی کیوں کہ اس موضوع پر پہلی کتاب تھی لیکن اب تو تین تین کتابیں سبقت لے گیں۔ فجزاھم اللہ اجمعین۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۲۲ مارچ ۲۰۱۹ء مطابق ۱۴ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

تمت بعون اللہ تعالیٰ

مراجع

قرآن حکیم			
ابوداؤد شریف	امام ابوداؤد	طبقات ابن سعد	محمد بن سعد واقدی
الاتقان	جلال الدین سیوطی	عقائد نسفیہ	امام نسفی
احکام القرآن	امام قرطبی	عقد الدرر	علامہ آلوسی
ازالۃ الخفاء	شاہ ولی اللہ	فیض ابرار	شیخ ابرار احمد
اصول الافتاء	شیخ تقی عثمانی	قصص النبیین	شیخ ابوالحسن ندوی
بخاری شریف	امام بخاریؒ	کنز العمال	شیخ علاؤالدین ہندی
ترمذی شریف	امام ترمذی	کتاب الخطط	علامہ مقریزی
تفسیر کبیر	امام رازی	کرامات امدادیہ	شاہ امداد اللہ
تعلیق الصبیح	مولانا محمد ادریس	مسلم شریف	امام مسلم
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	مؤطا مالک	امام مالک
جامع بیان العلم وفضلہ	ابن عبدالبر	مسند احمد	امام احمد
حلیۃ الاولیاء	ابونعیم	مشکوٰۃ المصابیح	خطیب تبریزی
حسامی	فقیہ اخسیکثی	مرقات شرح مشکوۃ	ملا علی قاری
حجۃ اللہ بالغہ	شاہ ولی اللہ	مظاہر حق	علامہ قطب الدین
حیاۃ الصحابہ	مولانا محمد یوسف	میزان العقائد	شاہ عبدالعزیز
دارمی	امام دارمی	مختصر المعانی	علامہ تفتازانی
روح المعانی	علامہ آلوسی	ملفوظات مولانا الیاس	مولانا محمد منظور
سنن کبری	امام بیہقی	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
سیرت خلفاء	مولانا عبدالشکور	مسجد کی آبادی کی	مولانا محمد سعد
شرح مسلم	امام نووی	نزھۃ النظر	حافظ ابن حجر
شرح عقائد	علامہ تفتازانی	نبراس	علامہ محمد عبدالعزیز
شرح نزھۃ النظر	ملا علی قاری	نہج الائمہ	مؤلف کتاب
شرح مأۃ عامل	میر سید شریف	ہماری ملی ذمہ داریاں	سید سلیمان
احیاء علوم الدین	امام غزالیؒ	اصلاحی خطبات	مفتی تقی عثمانی
سیرت منصور علاج	مولانا ظفر احمد عثمانی		